نقشِ نو

سالانہ عالمی جریدہ ۲۰۱۰ء-۲۰۱۱ء

میر تقی میر نمبر

گردش لطف سے اٹھا کے کوئی شفیق دل کو دوا اپنا ہے دوست دیا
ورنہ مرا جان من کو دیکھ کر سکتا تھا سے ساتھ

دل پر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

کیا جانوں ہیں چمن کو ولیکن قفس میں ہم
آتا ہے برگ گل کبھو کوئی صبا کے ساتھ

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

تب کس کو جو حال میر سے خالی اور پھر سب مجلس کا

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

شعبۂ اردو
حمیدیہ گرلس ڈگری کالج، الہ آباد
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

نقشِ نو

سالانہ عالمی جریدہ

شمارہ سوم

۲۰۱۰ء۔۲۰۱۱ء

مدیر: ناصحہ عثمانی معاون مدیر: زرینہ بیگم

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج

الہ آباد سنٹرل یونیورسٹی، الہ آباد۔ یو۔ پی۔ انڈیا

'نقشِ نو' سالانہ عالمی جریدہ۔شمارہ سوم

سرپرست: مسز تزئین احسان اللہ
نگراں: ڈاکٹر ریحانہ طارق

مجلسِ مشاورت:

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی
پروفیسر محمود الٰہی
پروفیسر عبدالباری

مجلسِ ادارت:

اعزازی مدیر: پروفیسر عبدالحق
مدیر: مسز ناصحہ عثمانی
معاون مدیر: مسز زرینہ بیگم

معاونین:

ڈاکٹر رفعت عشرت
ڈاکٹر یوسفہ نفیس
ڈاکٹر ندرت محمود
ڈاکٹر شبانہ عزیز

کمپیوٹر کمپوزنگ: مسز شمیمہ یاسمین

ناشر: شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، نوراللہ روڈ، الہ آباد۔یو۔پی۔انڈیا
فون نمبر: 0532-2656526 موبائل نمبر: 9559258741
ای میل: naqshe_nau@yahoo.in
hamidia_alld@yahoo.co.in
تاریخِ اشاعت: ۲۸؍فروری ۲۰۱۱ء
قیمت: اندرونِ ملک 50 روپئے، بیرونِ ملک 5 ڈالر (ڈاک خرچ الگ)

'نقشِ نو' کے مشمولات میں ظاہر کردہ نفسِ مضمون سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

(جملہ حقوق بحقِ شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج محفوظ ہیں۔)

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۱۔	اپنی بات		
۲۔	میرؔ صاحب کا زندہ عجائب گھر:۔	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	۶
۳۔	سرسری تم جہان سے گزرے۔۔۔	پروفیسر مامون ایمن	۴۶
۴۔	میر تقی میرؔ۔ دورِ انحطاط پر۔۔۔۔	ڈاکٹر سید عبدالباری	۵۴
۵۔	میرؔ کی شاعری میں عظمت۔۔۔۔۔	ڈاکٹر نسیم الدین فریس	۶۳
۶۔	میر تقی میرؔ کی فارسی شاعری	پروفیسر عبدالقادر جعفری	۷۱
۷۔	میرؔ اور آگرہ	پروفیسر علی احمد فاطمی	۸۶
۸۔	میرؔ کا معیارِ عشق	ڈاکٹر نفیس بانو	۹۸
۹۔	کلامِ میرؔ ایک نفسیاتی جھلک	ڈاکٹر ھما سعود	۱۱۱
۱۰۔	تذکرہ نکات الشعراء	ڈاکٹر فوزیہ بانو	۱۲۳
۱۱۔	شیریں زبان، شکستہ دل شاعر۔۔۔	ڈاکٹر لائق فاطمہ نقوی	۱۳۴
۱۲۔	سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو۔۔۔۔	ڈاکٹر شہناز صبیح	۱۴۷
۱۳۔	میرؔ بحیثیت مثنوی نگار	مسز زرینہ بیگم	۱۵۵
۱۴۔	اب تو بھی قلم رکھ دے۔۔۔۔۔	ڈاکٹر یوسفہ نفیس	۱۷۰
۱۵۔	ڈراما میر تقی میرؔ	نورینہ پروین	۱۸۱

اپنی بات

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ
کہ ہر غنچہ دلِ پُر آرزو تھا

تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور کے انسان کا یہ المیہ رہا ہے کہ وہ اپنے دور کے حالات سے نالاں اور بیزار رہا ہے کیونکہ اس کا پُر آرزو غنچۂ دل زمانے کی ناسازگاری کے باعث شگفتہ ہونے کے بجائے پُر داغ رہا ہے۔ اور ہر دور کا فعّال اور حساس انسان اپنے دور میں انقلاب لانے اور آدمی کو انسان بنانے میں کوشاں رہا ہے۔ پھر ہندوستان میں اٹھارہویں صدی کا بحرانی دور ایک عظیم الشان سلطنت کے زوال اور ایک شاطر عالمی طاقت کے عروج کا دور ہے جس نے صرف ہندوستانی سیاست کی بساط ہی نہیں الٹی بلکہ تہذیب کا رنگ ہی بدل ڈالا اور نوعِ انساں کو خود نوعِ انساں کا شکاری بنا دیا۔ ایسے لمحۂ فکریہ کے دور میں ایک عظیم اور حساس شاعر کی پیدائش ہوئی جس نے اپنے دل اور زمانے کے درد کو قلم کے ذریعہ پیکرِ تصویر میں ڈھالنا شروع کیا اور صفحۂ قرطاس پر ایسی پُر اشک لکیر کھینچ دی جو تا حال زمانے کے دل کی آواز بنی ہوئی ہے۔ ۲۰۱۰ء میں اسی شہِ شاعراں کی دوسو سالہ یومِ وفات ہے۔ 'نقشِ نو' کا زیرِ نظر شمارہ اسی بلند پایہ اور عہد ساز غزل گو شاعر میر تقی میرؔ کے سرمایۂ شعری کی نذر ہے جس کے لئے غالبؔ بھی کہہ اٹھے ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

جس شاعر کی غزلیہ شاعری کی عظمت کا اعتراف غالبؔ جیسے بلند پایہ غزل گو شاعر نے کیا ہو اس کی شعری عظمت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں انفرادی جذبات کی عکاسی کے باوجود ایک آفاقی شان ہے۔ اظہارِ درد کا جو طرز میرؔ نے اختیار کیا اس نے ان کے ذاتی الم کو اجتماعی بنا کر ان کی شاعری میں آفاقیت کی شان پیدا کر دی اور اپنے درد کو اپنا ہی نہیں زندگی کا عالمی تجربہ بنا کر پیش کیا چنانچہ ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

ایک دل کو ہزار داغ لگا اندرونے میں جیسے باغ لگا

جیسے اشعار صرف میرؔ کے دور کی نہیں ہر دور کے درد کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہیں۔ لہٰذا غزل کا شاعر ہونے کے باوجود غزل مخالف دور میں بھی میرؔ کی معنویت، اہمیت اور برتری میں کمی نہیں آئی اور موجودہ دور میں بھی ساری دنیا میں پھیلے سیاسی انتشار اور انسانیت سوز حالات میں جب انسان طاقت واقتدار کے نشے میں چور ہوکر کرۂ ارض پر خوں ریزی سے انسانیت کو رسوا کرتا ہے تو میرؔ کے اشعار ہمارے زخموں پر مرہم کا کام دیتے ہیں۔

دنیائے ادب کے ماہرین نے کلام میرؔ میں بہت سی جہتیں تلاش کی ہیں اور ہنوز محققین تلاشِ میرؔ میں سرگرداں ہیں۔ بڑے بڑے جید ناقدین اور میدانِ نقد کے شہ سواروں نے کلامِ میرؔ سے گہر ریزے تلاش کئے ہیں چنانچہ ہم جیسے ادنیٰ لوگوں کے لئے میرؔ فہمی کا کوئی دعویٰ کرنا ممکن ہی نہیں۔ ہم نے تو بس اپنی ناقص کوششوں سے میرؔ کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

محترم جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے شکریے کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ ان کی مہربانی اور شفقت ہمیں آگے بڑھنے کا عزم دیتی ہے۔ محترم جناب پروفیسر عبدالحق صاحب کے شکر گزار ہیں کہ ان کی رہبری اور مفید مشورے ہماری کامیابی کے ضامن ہیں۔ ہم ان تمام مقالہ نگار کے تعاون کے تہ دل سے شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنے بے حد مصروف اوقات سے موقع نکال کر ہمیں قلمی تعاون دیا۔ ہم کالج کی مینجر محترمہ تزئین احسان اللہ صاحبہ اور پرنسپل محترمہ ڈاکٹر ریحانہ طارق صاحبہ کے بھی شکر گزار ہیں کہ ان کی رہبری کے بغیر ہمارا کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہم اپنے کالج کی ان تمام اساتذہ کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ہمیں قلمی اور فکری تعاون دیا نیز کتابت کی ان طلباء کے بھی ممنون ہیں جنھوں نے اپنی دلکش خطاطی سے نقشِ نو کی زینت میں اضافہ کیا۔

ناصحہ عثمانی

میر صاحب کا زندہ عجائب گھر: کچھ تعجب نہیں خدائی ہے

محمد حسین آزاد نے میر کے بارے میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے گھر کے بارے میں ایک دوست سے کہا کہ مجھے خبر ہی نہیں کہ اس میں کوئی پائیں باغ بھی ہے۔ واقعہ نہایت مشہور ہے لیکن اسے محمد حسین آزاد کے گل وگلزار الفاظ میں سنا جائے تو لطف اور ہی کچھ ہوگا:

''میر صاحب کو بہت تکلیف میں دیکھ کر لکھنو کے ایک نواب انھیں مع عیال اپنے گھر لے گئے اور محل سرا کے پاس ایک معقول مکان رہنے کو دیا کہ نشست کے مکان میں کھڑکیاں باغ کی طرف تھیں۔ مطلب اس سے یہی تھا کہ ہر طرح ان کی طبیعت خوش اور شگفتہ رہے۔ یہ جس دن وہاں آ کر رہے، کھڑکیاں بند پڑی تھیں۔ کئی برس گذر گئے، اسی طرح بند پڑی رہیں، کبھی کھول کر باغ کی طرف نہ دیکھا۔ ایک دن کوئی دوست آئے، انھوں نے کہا، ''ادھر باغ ہے۔ آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے؟'' میر صاحب بولے، ''کیا ادھر باغ بھی ہے؟'' انھوں نے کہا کہ اسی لئے نواب آپ کو یہاں لائے ہیں کہ جی بہلتا رہے اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب کے پھٹے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے، ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اس باغ کی خبر بھی نہیں۔ یہ کہہ کر چپ ہو رہے۔

کیا محویت ہے! کئی برس گذر جائیں، پہلو میں باغ ہو اور کھڑکی تک نہ کھولیں۔ خیر۔ ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ انھوں نے دنیا کے باغ کی طرف نہ دیکھا۔ خدا نے ان کے کلام کو وہ بہار دی کہ سالہا سال گذر گئے، آج تک لوگ ورقے الٹتے ہیں اور گلزار سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔''

اس بیان کے داخلی تضادات کو دیکھتے ہوئے شاید ہی کسی کو اس بات میں کوئی شک ہو

پروفیسر شمس الرحمن فاروقی، الہ آباد

یہ واقعہ محض سنی سنائی گپ پر مشتمل ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے جن دو تذکروں پر کثرت سے بھروسا کیا ہے، ان میں یہ واقعہ مذکور نہیں۔ میری مراد قدرت اللہ قاسم کے ''مجموعۂ نغز'' اور سعادت خاں ناصر کے ''خوش معرکۂ زیبا'' سے ہے۔ لیکن ''آب حیات'' کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا ہے اور آج تک میر کے بارے میں عام تصور یہی ہے کہ وہ مردم بیزار نہیں تو دنیا بیزار ضرور تھے۔ دنیا اور علائق دنیا سے انھیں کچھ علاقہ نہ تھا، اپنے کلبۂ احزاں میں پڑے رہنا، دل شکستہ کے اوراق کی تدوین کرنا اور اپنی غزلوں کے ''پھٹے پرانے مسودے'' مجتمع کرتے رہنا گویا ان کا وظیفۂ حیات تھا۔

اگر مولانا محمد حسین آزاد کا بیان کردہ واقعہ فرضی ہے تو اغلب ہے کہ اس کی بنیاد میر کے حسب ذیل شعر پر قائم کی گئی ہوگی۔ دیوان پنجم میں میر کہتے ہیں۔

سرو لب جو لالہ و گل نسرین و سمن ہیں شگوفہ ہے
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

ملحوظ رہے کہ میر کا دیوان پنجم ۱۸۰۰ء کے آس پاس تیار ہوا تھا، یعنی جب وہ لکھنو میں تھے۔ اس لحاظ سے بھی یہ مفروضہ کچھ قوی ہو جاتا ہے کہ ''میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوں کہ اس باغ کی خبر بھی نہیں'' والی روایت کی تعمیر میں اس شعر کو بھی دخل ہوگا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اغلباً لکھنو ہی میں مرتب شدہ دیوان چہارم میں میر یہ بھی کہہ چکے تھے۔

کب تک دل کے ٹکڑے جوڑوں میر جگر کے لختوں سے
کسب نہیں ہے پارہ دوزی میں کوئی وصال نہیں

یہ بات ظاہر ہے کہ ''پارہ دوزی'' اور ''وصال'' جیسے الفاظ استعمال کرنے والا کوئی گھر گھسنا، روتا بسورتا شخص نہ ہوگا، بلکہ مختلف طبقوں اور پیشوں کے لوگوں سے واقفیت رکھتا ہوگا اور وہ بھی ایسی کہ انھیں شعر میں بحسن و خوبی استعمال بھی کر سکتا ہوگا۔ لفظ ''پارہ دوز'' کا استعمال، جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں، امیر مینائی کے بعد کسی نے نہیں کیا، اور امیر مینائی نے بھی بالکل میر کا

مضمون باندھا اور نہایت کمزور کر کے باندھا ۔

پارہ دوزی کی دکاں ہے کہ مرا سینہ ہے
ڈھیر ہیں لخت دل ولخت جگر کے ٹکڑے

(گوہر انتخاب، مطبوعہ ۱۸۷۳ء، ص ۵۸)

اور لفظ ''وصال'' کا یہ عالم ہے کہ آصفیہ، نور، اور پلیٹس، تینوں اس سے خالی ہیں۔

اشیا کے ناموں اور ان کے متعلق باتوں کا ذکر ہمارے یہاں نظیر، میر، اور اکبر الہ آبادی کے یہاں سب سے زیادہ ملتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کا معاملہ سب سے زیادہ منفرد ہے کیونکہ انھوں نے روزمرہ کی باتوں اور اشیا کو، اور خاص کر نئی اشیا کو شعر کا نہ صرف حصہ بنایا بلکہ انھیں نئی معنویت بھی عطا کی۔ انجن، ریل، برگڈ (Brigade) یعنی انگریزوں کے وفادار لوگ، کمپ (Camp) یعنی مغربی طرز معاشرت، کونسل، ممبر، پتلون، دھوتی، تہمد، اور پھر عام لوگوں کے نام جو بطور اشارہ استعمال ہو سکتے تھے، مثلاً بدھو، جمن، اور القاب، مثلاً شیخ، صاحب، پنڈت، اور نئے مضامین، مثلاً واٹر ٹیکس (Water Tax)، پانی کانل، پارک، اسکول، رات کی رکھی ہوئی روٹی، وغیرہ سینکڑوں نئی یا اجنبی اشیا اور ان کے متعلقات کے ساتھ معاملہ کرنا ہمیں اکبر ہی نے سکھایا۔ ظاہر ہے کہ اکبر کا زیادہ تر سروکار سیاسی اور سماجی معاملات سے تھا اور ان کے یہاں نئے الفاظ اور اصطلاحیں اسی سروکار کو ظاہر اور پختہ کرنے کے لئے آئی ہیں۔ اکبر کے برخلاف، نظیر اکبر آبادی کو عام زندگی، خاص کر عام شہری زندگی کے عام ہی لوگوں سے دلچسپی تھی۔ ان کے یہاں اشیا کی کثرت کچھ تو محض زور بیان اور خطیبانہ طرز کے لطف کی خاطر ہے، یا پھر زندگی کے ظاہری پہلوؤں انسانوں کے ظاہری طور طریقوں سے دلچسپی کے باعث ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے کلام میں الفاظ کے بیجا صرف یا غیر ضروری صرف کے باعث اشیا کی کثرت کوئی خاص معنی نہیں حاصل کرتی۔ کثرت، صرف کثرت بن کر رہ جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر، نظیر کے یہاں کثرت تو ہے لیکن تنوع نہیں۔ جوش صاحب کو نظیر کا کلام بہت پسند تھا اور ممکن ہے جوش صاحب کے یہاں الفاظ کی بیجا کثرت میں کچھ

نظیر اکبر آبادی کی بھی تاثیر شامل ہو۔

میرؔ کا معاملہ نظیرؔ اور اکبرؔ دونوں سے الگ ہے۔ یہ تو ہے ہی کہ میرؔ نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی غزلوں میں تازہ الفاظ استعمال کئے ہیں، اور ان کے یہاں اشیا کی بھی فراوانی ہے۔ لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ فراوانی کثرت معنی کے لئے بھی کام آتی ہے اور لفظے کہ تازہ است بہ مضموں برابر است کا بھی حکم رکھتی ہے۔ اکبر کے یہاں جس طرح کے الفاظ کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے، ان میں استعاراتی رنگ ہے اور کثرت استعمال کے باعث ان میں سے بعض میں علامتی رنگ بھی آ گیا ہے، مثلاً لفظ ''توپ'' کو وہ اپنے عام معنی سے مختلف اور پورے انگریزی طرز حکومت کے اقتدار کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ''کمپ'' (Camp) میں بھی یہی کیفیت ہے لیکن کم۔ میرؔ کے یہاں غزلوں میں نئے الفاظ اور اشیا، زندگی گذارنے کے طور کو بیان کرنے کے لئے بکار لائے گئے ہیں اور ان میں جانور اور انسان دونوں شامل ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔ یہ میں نے دیوان چہارم سے یوں ہی ایک ورق کھول کر حاصل کئے ہیں ؎

گھاس ہے مے خانے کی بہتر ان شیخوں کے مصلے سے
پاؤں نہ رکھ سجادے پہ ان کے اس جادے سے راہ نہ کر

کل سے دل کی کل بگڑی ہے جی مارا بیکل ہو کر
آج لہو آنکھوں میں آیا درد و غم سے رو رو کر

چھاتی جلی ہے کیسی اڑتی جو یہ سنی ہے
واں مرغ نامہ بر کا کھایا کباب کر کر

سبد پھولوں بھرے بازار میں آئے ہیں موسم میں
نکل کر گوشۂ مسجد سے تو بھی میر سودا کر

میرے ہی خوں میں ان نے تیغہ نہیں سلایا
سویا ہے اژدہا یہ بہتیرے مجھ سے کھا کر

آپ غور فرمائیں کہ محض دو صفحوں کو سرسری دیکھنے پر یہ لفظ ہاتھ آئے ہیں: گھاس، کل (بمعنی مشین)، مرغ کے کباب، بازار میں پھولوں بھرے سبد، تیغہ، اژدہا جو اپنے شکار کو کھا کر غنودگی کے عالم میں ہے۔ اس بات کو الگ رکھئے کہ کسی بھی غزل گو کے یہاں صرف دو صفحوں کے اندر اس طرح کے الفاظ اتنی تعداد میں نہ ملیں گے۔ آپ ان کے اقسام پر غور کیجئے:

نباتات (گھاس، پھول)

غیر انسانی اشیا (کل، پھولوں کی ٹوکریاں، تیغہ)

جانور (مرغ، اژدہا)

اجتماعی جگہیں (مے خانہ، مسجد، بازار)

خوردنی اشیا (کباب)

ہم لوگ عام طور پر میرؔ کے کلام کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ چہل پہل اور متحرک زندگی سے بھراپرا کلام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی ایک وجہ اشیا کی فراوانی بھی ہے۔ کرشن چندر نے منٹو کے بارے میں لکھا ہے، ''منٹو زمین کے بہت قریب ہے، اس قدر قریب کہ اکثر گھاس کے خوشے میں رینگنے والے کیڑے بھی اپنے تمام اوصاف کے ساتھ اسے نظر آجاتے ہیں۔'' غور کیجئے کہ میر کے سوا اور کس اردو شاعر کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے؟

یہاں تک تو غزلوں کا نہایت مختصر ذکر تھا، لیکن میر کی یہ صفت صرف غزلوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ مثنویوں اور دیگر منظومات میں بھی یہی انداز ملتا ہے، اور نہایت تنوع اور رنگارنگی کے ساتھ۔ خصوصاً جانوروں، ماحول کے تنوع اور نامانوس لیکن نہایت معنی خیز الفاظ کی کثرت نے میر کے کلام کو تمام اردو شاعری، بلکہ فارسی شاعری میں بھی ممتاز کردیا ہے۔ میرؔ کی غزلوں کی شہرت نے ان کی عشقیہ مثنویوں کو دبالیا ہے۔ اور عشقیہ مثنویوں کی شہرت نے ان کی ہجوؤں اور مختلف طرح کی خودنوشتی یا گھریلو نظموں کو دبالیا ہے، حتیٰ کہ ایسی بعض نظمیں تقریباً گمنام ہیں۔ پھر میرؔ کے دیگر کلام نے ان کے مرثیوں اور منقبتی نظموں کو تو بالکل ہی کنج خمول میں ڈال دیا۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ کلام ملتا نہیں ہے۔ بہت اچھے ایڈیشنوں میں نہ سہی، لیکن میر کا رثائی کلام بھی ملتا ہے اور مثنویوں، ہجوؤں وغیرہ کو تو کوئی شخص کہیں بھی حاصل کرسکتا ہے۔ بہر حال، کوشش کی گئی ہے کہ میرؔ کا سارا معلوم کلام ممکن حد تک صحیح صورت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو کی شائع کردہ کلیات میر کی جلد اول اور جلد دوم میں سامنے آجائے اور ہمیشہ موجود رہے۔

یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ میرؔ نے جانوروں پر، یا جانوروں کے بارے میں، کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ ان میں ''اژدرنامہ'' اس وقت سے مشہور ہے جب محمد حسین آزادؔ نے اس کا ذکر کیا، کہ میر نے اس مثنوی میں خود کو اژدہا اور دوسرے تمام شعرا کو حشرات الارض فرض کیا ہے۔ مولانا آزاد نے اس باب میں جو روایت ''آب حیات'' میں درج کی ہے وہ قدرت اللہ قاسم کے تذکرے ''مجموعۂ نغز'' کی متعلقہ عبارت کا تقریباً ترجمہ ہے۔ لہٰذا میں آزاد ہی کی عبارت نقل کرتا ہوں:

> ''دلی میں میر صاحب نے ایک مثنوی کہی۔ اپنے تئیں اژدہا قرار دیا اور شعرائے عصر میں کسی کو چوہا، کسی کو سانپ، کسی کو بچھو، کسی کو کنکھجورا، وغیرہ وغیرہ ٹھیرایا۔ ساتھ اس کے ایک حکایت لکھی کہ دامن کوہ میں ایک خونخوار اژدہا رہتا تھا۔ جنگل کے حشرات الارض جمع ہو کر اس سے لڑنے گئے۔ جب سامنا ہوا تو اژدہے نے ایسا دم بھرا کہ سب فنا ہو گئے۔ اس قصیدے (کذا) کا نام اجگر نامہ (کذا) قرار دیا اور مشاعرے میں لا کر پڑھا۔ محمد امان نثار، شاہ حاتم کے شاگردوں میں ایک مشاق موزوں طبع تھے۔ انھوں نے وہیں ایک گوشے میں بیٹھ کر چند شعر کا قطعہ لکھا اور اسی وقت سر مشاعرہ پڑھا۔ چونکہ میر صاحب کی یہ بات کسی کو پسند نہ آئی تھی، اس لئے قطعے پر خوب قہقہے اڑے اور بڑی واہ واہ ہوئی۔ اور میر صاحب پر جو گذرنی تھی سو گذری۔ چنانچہ مقطع قطعۂ مذکور کا یہ ہے ؎
>
> حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر''

قدرت اللہ قاسم نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس مثنوی، ''بلکہ اس کے کہنے والے (میرؔ) پر فی الحقیقت صد ہزار نفرین تھی۔'' مولانا آزاد نے اس بات کو ذرا نرم کر کے لکھا ہے اور یہ میر پر ان کی مہربانی ہی کہی جائیگی۔ لیکن ظلم انھوں نے یہ کیا ہے کہ ''اژدرنامہ'' کو شاید خود انھوں نے پڑھا نہیں۔ اس کا نام وہ ''اجگر نامہ'' لکھتے ہیں اور ایک ہی سانس میں اسے مثنوی اور پھر قصیدہ بتاتے ہیں۔ بہرحال عام تاثر یہی ہے کہ ''اژدرنامہ'' میر کی بدمذاقی اور ان کے یہاں حس مزاح کی کمی کا

پکا ثبوت نہیں تو خام نمونہ ضرور ہے۔

خیر، میرؔ کی حس مزاح تو غالب سے بھی بڑھ کر تھی، لیکن اس باب میں بھی ان کی شہرت یہی ہے کہ بقول مولوی عبدالحق یا مجنوں گورکھپوری، میر کو گریہ وزاری کے سوا کوئی فن آتا ہی نہ تھا۔ اب رہی بدمذاقی، تو اٹھاون (۵۸) شعروں کی اس مثنوی میں میر نے بہت سے بہت پندرہ شعر ہجو یہ لکھے ہیں اور کسی کا نام نہیں لیا ہے۔ مثنوی کے اختتام میں وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ''گزندے'' ہیں اور میرا مقابلہ نہیں کر سکتے اور مجھے ان لوگوں کی داد مطلوب نہیں، میں ان سب سے الگ رہتا ہوں۔ میں سب سے آخری تین شعر نقل کرتا ہوں ؎

تو کیا ہوا نھوں سے بہت دور میں ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور میں

مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے

کہاں پہنچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

لہٰذا پہلی بات تو یہ کہ اس نظم میں مدعیانہ قسم کی محض ہجو نہیں لکھی گئی ہے۔ میرؔ نے اپنے معاصروں کو چھوڑ کر گوشہ گیر ہو جانے کی بات بھی کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میں اپنا مرتبہ خود جانتا ہوں، کسی کی رسائی اس تک نہیں ہو سکتی۔ ان مضامین میں بدمذاقی نہیں، اپنے غم واندوہ کی طرف اشارہ، دوسروں سے بیزاری، معاصروں کے استخفاف، اور اپنی بڑائی کے پہلو ضرور ہیں۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں جسے خاص میر کا قصور ٹھہرایا جائے۔ نئی بات تو یہ ہے کہ پوری مثنوی جانوروں کے نام اور ان کے عادات وخواص کے ذکر سے بھری ہوئی ہے، بلکہ لگتا ہے کہ یہ مثنوی لکھی ہی اسی لئے گئی تھی کہ انھیں باتوں کو نظم کیا جائے۔ چند شعر دیکھئے ؎

کہاں چھپکلی اژدہے سے لڑی کس اژدر پہ ایسی قیامت پڑی

ہزار اجگر اندوہ سے جائے لٹ ولے ایسے کیڑے مکوڑے ہیں چٹ

جہاں شور اژدر سے ہے دھوم دھام کوئی کن سلائی سے نکلے ہے کام

کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم درندوں کے بھی دل تھے اس سے دونیم

نکلتے نہ تھے اس طرف ہو کے شیر پلنگ و نمر واں نہ رہتے تھے دیر

جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب

شغال اور روبہ کا واں کیا حساب

گئے جان لے لے وحوش و طیور

کوئی رہ گیا موش و مینڈک سا دور

گئی لومڑی ایک سوکھی ہوئی

کسی اور جنگل میں بھوکھی ہوئی

خراطین و خرموش و موش و شغال

اس اژدر کو کر جنس اپنی خیال

وہ گرگٹ کہ جس میں تھی گردن کشی ہوئی خوف سے اس پہ طاری غشی

قدم غوک سے گرد کا جل گیا بھروسا تھا گیدڑ پہ سو ٹل گیا

ایک سرسری گنتی کے مطابق (مکررات کو چھوڑ کر) میرؔ نے اس نظم میں تیس (۳۰) جانوروں کے نام لئے ہیں۔ چونکہ ''اژدرنامہ'' کا مرکزی کردار (یا مرکزی جانور) اژدہا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ''مورنامہ'' کے بھی کچھ شعر دیکھ لئے جائیں کہ اس مثنوی میں بھی اژدہوں کا ذکر بہت ہے۔

''مورنامہ'' اپنی طرح کی انوکھی داستان یوں بھی ہے کہ اس میں ایک مور اور ایک رانی کے عشق کا بیان ہے۔ جانوروں اور ننھی منی اشیا سے میرؔ کو کس قدر دلچسپی ہے، اس کے ثبوت میں پہلے تو اس بات کو ملحوظ رکھئے کہ میرؔ اس امکان کے قائل ہیں کہ اگر انسان کو جانور سے محبت ہو سکتی ہے تو جانور کو بھی انسان سے محبت ہو سکتی ہے، اور یہ محبت اسی طرز و طور کی ہے جسے انسانوں کی زبان میں ''عشق'' کہتے ہیں۔ بہر حال، مور اور رانی کے باہمی انس یا عشق کا راز عام ہو جاتا ہے تو راجا کو بھی اس کی خبر لگتی ہے اور مور اچانک پراسرار طور پر غائب ہو جاتا ہے اور بالآخر ایک دشت

ہولناک میں جار ہتا ہے۔ کچھ منتخب شعر ملاحظہ ہوں۔

راہ میں ان سب کو یہ آئی خبر　　جس بیاباں میں ہے وہ تفتہ جگر
خار کا جنگل نہیں ہے دشت مار　　روز روشن میں بھی ہے تیرہ و تار
دم کش اژدر نکلے ہے گر سیر کو　　دور سے کھینچے ہے وحش و طیر کو
جلتے ہیں آتش زبانی سے بہت　　پتلے ہو جاتے ہیں پانی سے بہت

ہے عجب ماروں میں مورا آکر رہے
مار بھی پھر کیسے اژدرا اژدہے
مرغ کر جاتے ہیں مرغ انداز دس　　مرغ انداز کرنا=گھونٹ جانا
کیا کریں اک مور کے کھانے سے بس

ہے زمانے سے بھی دھیمی ان کی چال　　جن سے ہیں کیڑے مکوڑے پائمال
جیب کو اپنی گزوں تک دیں ہیں طول　　خشت وسنگ وخاک تک کھاویں اکول

ہر قدم خطرہ کہ ہیں شیر و پلنگ
اس پہ سر ماریں کہ رہ پر خار وسنگ
ہاتھی ارنے خوک کی واں باش وبود
کرگدن کی دھوم سے اکثر نمود
جنگ حیوانات سے ہے بیش تر　　ہیں طرف اژدر نمر شیراں شتر
آئے ہاتھی بھی اتر گر کوہ سے
ہو سکے گا پھر نہ کچھ انبوہ سے
ہو گیا بارا ہ سد راہ گر　　باراہ=جنگلی خنزیر
لیویں گے جا کر نفر راہ دگر
ہوا گر جاموش دشتی سے مصاف

تو کوئی دم ہی کو ہے میدان صاف

ہو گئی گر خرس سے استادگی　　درمیاں آجائے گی افتادگی

منھ اگر گرگ بغل زن آ گیا　　دیکھیو پیٹھ اک جہاں دکھلا گیا

پوری مثنوی میں جانوروں کے ناموں، اور آگ اور موت کے متعلق پیکر ہیں، وہ بھی اس طرح، کہ رعایتوں اور مناسبتوں کا بھی ایک جنگل سا بنا دیا ہے۔ اوپر کے اشعار سے قطع نظر کر کے نظم کے آخری حصے سے کچھ متفرق شعر نقل کرتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جانوروں سے شدید محبت اور شغف اور ان کی تفصیلات سے دلچسپی کے بغیر ''باراہ'' جیسا لفظ میر جیسے بڑے شاعر کو بھی نصیب نہ ہوتا۔ سری وشنو جی کا ایک روپ جنگلی سور کا ہے۔ چونکہ سنسکرت میں سور کو varaha کہتے ہیں، اس لئے وشنو جی کا ایک نام Varahamira بھی ہے اور اس روپ میں ان کی صفت شفائے امراض ہے۔ میر نے کہیں سے varaha سنا اور اسے ''باراہ'' میں بدل دیا۔ یہ لفظ ''لغت نامۂ دہخدا'' میں ہے، لیکن وہاں اس کے معنی غلط لکھے ہیں، اور ''دہخدا'' کا وجود میر کے زمانے میں نہ تھا۔ ''باراہ'' انھوں نے جہاں سے بھی دریافت کیا ہو، اسے اعجاز سخن گوئی ہی کہیں گے۔ اسی طرح، ''مرغ انداز کرنا'' یعنی بے چبائے ہوئے لقمہ گھونٹ جانا بھی طرفہ پیکر ہے کہ محاورے کا محاورہ ہے، رعایت کی رعایت، اور ''مرغ'' اور ''مرغ انداز'' کا ایہام اس پر مستزاد۔

اس جملۂ معترضہ کے بعد ہم ''مور نامہ'' کے کچھ اور اشعار نقل کرتے ہیں جن میں رعایت اور مناسبت کی بہت لطیف کارفرمائی ہے اور آسانی سے نظر نہیں آتی ؎

جدول ان کی تیغ کی جاری رہے

ان کی تر دستی سے وہ عاری رہے

''جدول'' بمعنی ''نہر'' (تلوار کی آب کی مناسبت سے اسے جدول کہتے ہیں)، ''جدول'' کی مناسبت سے ''جاری'' اور ''جاری'' کی مناسبت سے ''تر دستی''، اور پھر ''تیغ'' کی مناسبت سے ''عاری (آری)'' کہ جب تلوار کی دھار میں دندانے پڑ جاتے ہیں تو کہتے ہیں،

''تلوار آری ہوگئی۔'')

آگ پھیلی ان بنوں میں دور تک
جل گئے حیوا ں کئی لنگو ر تک

لنگور کو ہنومان جی کی اولاد کہتے ہیں اور ہنومان جی تو لنکا پھونک دی تھی لیکن خود ان پر آگ نے صرف اتنا اثر کیا تھا کہ ان کا منھ جھلس گیا تھا۔ لہٰذا یہاں لنگوروں کے جل جانے میں مزید لطف اور لطافت ہے۔

یعنی رانی نے سنی جو یہ خبر
آتش غم سے جلا اس کا جگر
کھینچ آہ سرد یہ کہنے لگی
عشق کی بھی آگ کیا بہنے لگی
بن جلا کر بستیوں میں آ لگی
پھیل کر یاں دل جگر کو جا لگی

آتش غم اور آہ سرد اور عشق کی آگ کے لئے ''بہنا'' کا لفظ استعمال کرنا پر لطف ہے، کہ کیا آگ پانی کی طرح بہتی ہے جو جنگل سے بستیوں تک آ گئی۔ ''لگی'' خود آگ کے لئے روزمرہ ہے، چنانچہ کہتے ہیں، ''لگی بجھانا''۔ اور ''آ لگنا'' کی مناسبت سے ''بہنا'' اور ''پھیلنا'' کس قدر خوب ہیں۔

میر کا کلام اس قدر متنوع ہے کہ اس میں ''مور نامہ'' کوئی انوکھی مثنوی نہیں ہے۔ لیکن اس کی شاعرانہ نزاکتوں سے قطع نظر بھی کیجئے (کیونکہ وہ میر کے تمام کلام میں موجود ہیں) تو دو بنیادی باتیں نظر آتی ہیں۔ ایک کا ذکر میں پہلے ہی کر چکا ہوں، یعنی تمام طرح کے جانوروں اور عام اشیا سے میر کی غیر معمولی دلچسپی، اور دوسری بات یہ کہ میر کی نظر میں جانور بھی انسانوں کی کئی صفات سے متصف ہیں۔ یعنی جانوروں میں نزاکت طبع، شائستگی اور جرأت کردار بھی ہے، اور وہ جذبہ اور احساس کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ یعنی بات صرف اتنی نہیں کہ عشق کی آگ میں

سب کھپ جاتے، جیسا کہ میر نے ''مور نامہ'' کے خاتمۂ کلام میں کہا ہے ۔

عشق سے کیا میر اتنی گفت و گو
خاک اڑادی عشق نے چار سو
طائر و طاؤس و حیواں اژدہے
سب کھپے کیا عشق کی کوئی کہے

سرسری طور پر میر کا ''مور نامہ'' ہمیں شاید نظیر اکبر آبادی کے ''قصۂ ہنس'' کی یاد دلا سکتا ہے۔ ''قصۂ ہنس'' میں تمام چڑیاں ایک نو آمدہ ہنس پر عاشق ہو جاتی ہیں۔ نظیر نے چڑیوں کے نام اس کثرت سے جمع کئے ہیں کہ خیال ہوتا ہے جرأت کو اپنے شہر آشوب میں استعمال کرنے کے لئے یہ ترکیب یہیں سے ذہن میں آئی ہوگی۔ لیکن نظیر کی فہرست بھی جرأت کی طرح فہرست ہی ہے، اس سے کوئی معنوی بعد نہیں پیدا ہوتا۔ اور ہنس دراصل روح انسانی کی تمثیل ہے کہ جب ہنس اپنے مرجع کو واپس جاتا ہے تو کچھ دیر تو اس کی چاہنے والی چڑیاں اس کے ساتھ چلنے کا دعویٰ رکھتی ہیں، پھر فانی کے مصرعے کے مصداق تھک تھک کر اس راہ میں آخر ایک اک ساتھی چھوٹ گیا۔ ''قصۂ ہنس'' کے آخری دو بند ہیں ۔

تھی اس کی محبت کی جو ہر ایک نے پی مے
سمجھے تھے بہت دل میں وہ الفت کو بڑی شے
جب ہو گئے بے بس تو پھر آخر یہ ہوئی رے
چیلیں رہیں کوے گرے اور باز بھی تھک گئے

اس پہلی ہی منزل میں کیا سب نے کنارہ
دنیا کی جو الفت ہے تو اس کی ہے یہ کچھ راہ
جب شکل یہ ہووے تو بھلا کیوں کے ہو نر باہ
ناچاری ہو جس میں تو وہاں کیجئے کیا چاہ

سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ

آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سدھارا

نظیر کی نظم میں وہ سب خوبیاں اور عیب ہیں جو نظیر کا خاصہ ہیں۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ ان کے جانور یا تو جانور ہیں یا تمثیلیں ہیں، ان میں نہ پورا جانور پن ہے نہ پورا انسان پن۔ اور دوسری بات یہ کہ ہنس پر عاشق ہونے والے سب اس کے ہم جنس ہیں۔ ''مور نامہ'' ایک رانی [یعنی ایک انسان] اور ایک مور [یعنی ایک حیوان] کے عشق کی داستان ہے اور بالآخر دونوں جل مرتے ہیں۔ ان کی زندگی اور موت دونوں میں المیہ کی شان ہے جس کے سامنے نظیر کی تمثیل پھیکی معلوم ہوتی ہے۔

میر کی نظر میں جانور اور اجناس واشیا سب قابل ذکر ہیں۔ اس بات کی تفصیل کے لئے ہمیں کچھ مثنویاں اور دیکھنی ہوں گی۔ مثلاً عنوان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ '' کپی کا بچہ'' نظیر اکبر آبادی کے طرز کی نظم ہوگی۔ لیکن میر کے یہاں بندر کا بچہ کم وبیش انسان نظر آتا ہے۔

اس کے پردادا نے ہے یہ حرف دی — دی = گذشتہ پچھلا دن، دیروز

ایک دم لابہ میں لنکا پھونک دی

ایک چنچل ہے بلائے روزگار

ہاتھ رہ جائے تو پا سرگرم کار

ہے تو بچہ سا ولیکن دور ہے

پست اس کی جست کا لنگور ہے

کیا کوئی انداز شوخی کا کہے

ہو معلق زن تو آدم تک رہے — معلق زن ہونا = اچھلنا

اچپلاہٹ اس کی سب معلوم ہے

معرکوں میں چوک کے اک دھوم ہے

ہوتے ہیں اس جنس میں بھی ذی خرد

آدم وحیواں میں یہ برزخ ہیں بد　　بد=سب سے الگ

طنز ہے یہ بات اگر چہ ہے کہی

جو کرے انسان تو بوزینہ بھی

لیکن اس جا گہ تو صادق ہے یہ قول

سارے اس کے آدمی کے سے ہیں ڈول

میر کی نظم میں اس مربیانہ، احساس برتری سے مملو رویئے کا شائبہ تک نہیں جو ہمیں نظیر اکبر آبادی کی نظموں اور سید رفیق حسین کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ان دونوں کے یہاں جانور صرف جانور ہیں۔ اور جہاں ایسا نہیں ہے مثلاً سید رفیق حسین کے افسانے ''گوری ہو گوری'' میں، تو وہاں تصنع صاف جھلکتا ہے۔ اور نظیر کی نظم ''ریچھ کا بچہ'' میں متکلم مداری ہے اور ریچھ کا بچہ تفریح کا سامان۔ اگر چہ وہ سج دھج میں پری جیسا تھا لیکن تھا وہ جانور ہی، اور وہ بھی قیدی جانور۔

تھا ریچھ کے بچے پہ وہ گہنا جو سراسر

ہاتھوں میں کڑے سونے کے بجتے تھے جھمک کر

کانوں میں در اور گھنگھرو پڑے پاؤں کے اندر

وہ ڈور بھی ریشم کی بنائی تھی جو پرزر

جس ڈور سے یار و تھا بندھا ریچھ کا بچہ

جھمکے وہ جھمکتے تھے پڑے جس پہ کرن پھول

مقیش کی لڑیوں کی پڑی پیٹھ اپر جھول

اور ان کے سوا کتنے بٹھائے تھے جو گل پھول

یوں لوگ گرے پڑتے تھے سر پاؤں کی سدھ بھول

گویا وہ پری تھا کہ نہ تھا ریچھ کا بچہ

کہا جا سکتا ہے کہ میر نے جانور کو انسان کی سی صفات سے متصف کر کے کچھ کمزوری کا ثبوت دیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر جانور کو مربیانہ اور برتری کی نظر سے دیکھنا غلط ہے تو اسے انسان صفت (Anthropomorphic) بتانا بھی غلط ہے۔ یہ بات صحیح ہے، لیکن یہ نکتہ ملحوظ رکھئے کہ جانوروں سے دلچسپی رکھنا، ان کے وجود کو وجود ماننا، ان کے حقوق کا قائل ہونا، ان کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرنا، یعنی ان کے ساتھ یک دردی (Empathy) رکھنا، مربیانہ دلچسپی، یا کارآمد ہونے کے باعث ان کو اپنا مطیع بنانے سے بدرجہا بہتر ہے۔ دوسری بات یہ کہ جانوروں سے میر کا یہ شغف دراصل اشیا اور دنیائے انسان کے مختلف مظاہر سے دلچسپی کے باعث ہے۔ میر کی یک دردی (Empathy) اشیا و مظاہر سے ان کی محبت کی دلیل ہے، اور اس صفت میں اردو کا کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں۔ مزید مثال کے طور پر ''موہنی بلی'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بلیاں ہوتی ہیں اچھی ہر کہیں
یہ تماشا سا ہے بلی تو نہیں

گر درو باندھے تو چہرہ حور کا
چاندنی میں ہو تو بکا نور کا

گرد رو = پھولوں یا موتیوں وغیرہ کا گلوبند

☆

بلی کا ہوتا نہیں اسلوب یہ
ہے کبودی چشم یک محبوب یہ
دیکھے جس دم یک ذرا کوئی اس کو گھور

چشم شور آفتاب اس دم ہو کور
داغ گلزاری سے اس کے تازہ باغ
اس زمان تیرہ کی چشم و چراغ

چشم شور = چشم بد

کیا دماغ اعلیٰ طبیعت کیا نفیس
کیا مصاحب بے بدل کیسی جلیس
یہ نفاست یہ لطافت یہ تمیز
آنکھ دوڑے ہی نہ ہو کیسی ہی چیز

یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ میر کی بلی انسانوں کے اعلیٰ صفات سے متصف ہے۔ جانوروں پر نظمیں دنیا کے بہت سے شعرا نے لکھی ہیں۔ یہاں بودلیئر (Charles Baudelaire, 1821-1867) کی نظمیں فوراً یاد آتی ہیں۔ بودلیئر نے بلی (یا بلیوں) پر تین نظمیں لکھی ہیں اور تینوں میں وہ بلی کے مزاج میں کسی نہ کسی طرح کا انسان پن دیکھتا ہے۔ پہلی نظم میں وہ کہتا ہے:

جب میری انگلیاں آزادانہ تمھارے سر
اور لچک دار کمر کو سہلاتی ہیں
تو میرے ہاتھ میں تمھارے برقیلے بالوں
کے لمس سے ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے

اور مجھے اپنی معشوقہ یاد آنے لگتی ہے، اس کی نگاہ
سرد اور گہری، جیسے تمھاری آنکھیں...

دوسری نظم میں بودلیئر ایک قدم آگے جا کر کہتا ہے:

ایک بلی میرے ذہن میں
بل کھاتی ہوئی محو خرام ہے، جیسے
وہی یہاں کی مالک ہو،
چکنی، سڈول، رعونت سے بھری ہوئی لیکن

اس درجہ، کہ جب وہ میاؤں کرتی ہے تو مجھے
موسیقی سنائی دیتی ہے۔

بودلیئر کی تیسری نظم کے یہ مصرعے تو لگتا ہے میر نے لکھے ہوں:

عشاق، اور علما، یعنی جوشیلے جذبات والے لوگ اور
خشک، ریاضت پسند لوگ، ان سب کو
بلیوں سے محبت ہو جاتی ہے، بلیاں، ان کے گھروں کا افتخار،
دونوں ہی کی طرح انھیں بھی سردی زکام بہت جلد لگ جاتے ہیں،
دونوں ہی کی طرح یہ بھی چلت پھرت میں کم، لیکن
چکنی، سڈول اور قوت مند۔

عرب تہذیب کے ساتھ طویل ربط ضبط کے باعث فرانس اور مشرق میں بعض باتیں مشترک ضرور ہیں، (مولانا ابوالکلام آزاد کا قول تھا کہ نپولین کے قوانین جو Napoleonic Code کے نام سے مشہور ہیں اور آج بھی فرانسیسی قانون کی بنیاد ہیں، فقہ شافعی پر مبنی ہیں) لیکن میر اور بودلیئر میں جانوروں، اور خاص کر بلی کے بارے میں یہ مطابقت بہر حال حیرت انگیز ہے۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ میر کے پیکر زیادہ تر بصری اور حرکی ہیں اور بودلیئر کے پیکر اس کی اپنی افتادِ مزاج کے مطابق لمسی اور شامی ہیں۔ بلی کے بارے میں میر کو پھر سنئے اور فیصلہ کیجئے کہ بودلیئر اگر اردو میں کہتا تو اس سے بہتر کیا کہتا۔ یہ ''تسنگ نامہ'' کے اشعار ہیں۔ اوپر جس بلی کا ذکر تھا اس کا نام موہنی تھا۔ یہ بلی جو تسنگ کے سفر میں کھو گئی، سوہنی کے نام سے موسوم تھی۔

رنگ جیسے کہ وقت گرگ و میش

یعنی سرخی تھی کم سیاہی بیش
جن سے مالوف تھی وہیں رہتی
ان سے کچھ کچھ نگاہوں میں کہتی
کیا نفاست مزاج کی کہیئے
ستھری اتنی کہ دیکھ ہی رہیئے
خال جوں پھول گل کترتے ہیں
یا کہ نقشوں میں رنگ بھرتے ہیں

بلیوں کے اس قدر ذکر سے آپ کو یہ گمان نہ ہونا چاہیئے کہ میر کے عجائب گھر میں کچھ ہی جانور اور کچھ ہی اشیا ہیں۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میر کو تمام اشیا و مظاہر سے دلچسپی ہے۔ مرغ اور مرغ باز بھی ان کی دلچسپی کا مرکز ہیں، بکریاں بھی اور کتے بھی، اور چھوٹے موٹے جانوروں اور چیزوں کا تو شمار ہی کیا ہے۔ اسی ''تسنگ نامہ'' کے چند شعر ہیں۔

بیچ میں ہوتے کچھ اگر اسباب
منھ اٹھانے کی جی میں ہوتی تاب
سو تو کمل نہ پٹونے لوئی
سایہ گستر نہ ابر بن کوئی
ابر ہی بے کسی پہ روتا تھا
ابر ہی سر کا سایہ ہوتا تھا
کیچ پانی میں کپڑے خوار ہوئے
وو ہیں گاڑی میں جا سوار ہوئے
رہروی کا کیا جو ہم نے میل
بھینس چہلے کے تھے بہل کے بیل

چہلا = دلدلی کیچڑ

آسماں آب سب زمیں سب کیچ
خاک ہے ایسی زندگی کے بیچ

ان اشعار میں ظرافت بھی ہے، اپنی بے چارگی پر غصہ بھی ہے، روزمرہ کے سامانوں کا ذکر بھی ہے اور وہ مناسبات لفظی بھی ہیں جن کے بغیر میر لقمہ نہیں توڑتے تھے۔ ''منھ اٹھانا'' بجائے ''قدم/ پاؤں اٹھانا''؛ ابر کی طرح سایہ گستر بھی کوئی نہیں، اور ابر ہی ہماری بے کسی پر گریہ کناں بھی ہے؛ ابر کی طرح کی سایہ گستری کی تلاش اور سر پر وہی ابر سایہ بن کر گریہ کناں؛ اور آخری شعر تو شاہکار ہے۔

آسماں آب سب زمیں سب کیچ
خاک ہے ایسی زندگی کے بیچ

میر کی دنیا میں سمندر اور سیلاب بھی ہیں، لیکن ان کا ذکر میں یہاں اس لئے نہیں کرتا کہ غزلوں پر بحث کرتے ہوئے ایسے کئی شعر میں نے ''شعر شور انگیز'' میں جگہ جگہ نقل کئے ہیں۔ برسات کے بھی اچھے اور برے مناظر میر کے یہاں بے شمار ہیں۔ لیکن اب چونکہ پانی کا ذکر آ گیا ہے تو ''شکارنامۂ اول'' سے کچھ شعر سنئے۔ پہلا بیان چڑھے ہوئے دریا (غالباً گھاگھرا) کا ہے۔

ہوا حائل راہ بحر عمیق
کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق
قریب آ کے اتری یہ خائف تھی فوج
کہ بے ڈول اٹھتی تھی ہر ایک موج
مہیب اور آلودۂ خاک و آب
بعینہ پھٹی آنکھ تھا ہر حباب
غضب لجہ خیزی بلا جوش پر
تلاطم قیامت لئے دوش پر

چلے بس تو کچھ کوئی چارہ کرے
مگر دیکھ کر ہی کنارہ کرے

یہاں بھی میر نے روزمرہ کی چیزوں کا لحاظ رکھا ہے۔ ''بے ڈول موج'' اور ''پھٹی آنکھ تھا ہر حباب'' تعریف سے مستغنی ہیں لیکن مندرجہ بالا اقتباس کا آخری شعر تو اعجاز سخن گوئی ہے: ''مگر'' بمعنی ''لیکن'' اور بمعنی ''مگر مچھ''، اور پرشور ساحل دریا کے اعتبار سے ''کنارہ کرے''، یہ رعایتیں اسی کو سوجھ سکتی ہیں جو زبان کا سچا نباض اور اس کے خلاقانہ امکانات کے اعماق میں پوری طرح اترا ہوا ہو۔ اب ذرا سردی میں برسات کا ایک رنگ دیکھئے۔ یہ بھی ''شکارنامۂ اول'' میں ہے ؎

ہوا ایک ابر اس جبل سے بلند
ہوا پر بچھے اس کے یزدی پرند

یزدی = شہر یزد کی بنی ہوئی؛ پرند = چادر، دوشالہ

پہر دن سے بارش لگی ہونے زور
رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور
ہوئے خیمے پانی کے اوپر حباب
سب اسباب لوگوں کا تھا زیر آب
نہ پوچھا اور اسباب مردم کا حال
نہ چادر رہی خشک نے کوئی پال

☆

بھرا پانی لشکر میں پھیلا ہوا
اگر فرش بستر تھا تھیلا ہوا
ہوا سرد از بس ہوئی ایک بار
کلیجوں کے ہوتی تھی برچھی سی پار
پھرے باد سے لوگ منھ ڈھانپتے

جگر چھاتیوں میں رہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کیدھر شکار
ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار

مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوا ہوگا کہ میر کے شکار نامے دراصل جنگل کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا بیان ہیں۔ لوگ عموماً شکایت کرتے ہیں کہ اردو کے شاعر مناظر قدرت سے دور ہیں، عام زندگی سے دور ہیں، معمولی درجے کے لوگوں کو نظر انداز کرتے ہیں، وغیرہ۔ لیکن میر کی مثنویاں اور ہجویں ایک نگاہ غلط انداز سے بھی دیکھ لی جاتیں تو جھوٹ کا یہ طلسم شکست ہو جاتا۔ نظیر کے بارے میں ہم نے بہت سنا ہے، لیکن نظیر اپنے شہر کے باہر کم، بہت ہی کم جاتے ہیں۔ میر تو گاؤں گاؤں گھومتے ہیں اور وہاں کے حالات میں خود کو شریک کرتے ہیں۔ وہ ہنستے بھی ہیں، مذاق بھی اڑاتے ہیں، لیکن یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہم بھی اسی زندگی کا حصہ ہیں۔ ''تسنگ نامہ'' کے یہ اشعار دیکھئے۔

ہم کو کھانے ہی کا تردد ہے
صبح بقال کا تشدد ہے
بنیا منھ کو چھپائے جاتا ہے
روٹی کا فکر کھائے جاتا ہے

☆

تم کہو دال ماش کی ہے زبوں
یاں بہم پہنچے ہے جگر ہو خوں
تم کہو آٹا کسکسا کھایا
یاں کلیجا چھنا تو ہاتھ آیا

☆

ماش کی دال کا نہ کریئے گلہ

گوشت یاں ہے کبھو کسو کو ملا
جی اگر چاہے کوئی ترکاری
گول کدو ملے بصد خواری
بھنڈی بینگن کے ناؤں ڈھینڈس تھا
اروی توری بغیر جی بس تھا

☆

گھانس ہی گھانس اس مکاں میں تمام
تس میں لساع جانور اقسام
لساع = ڈسنے والے
جیسے زنبور زرد ایسے ڈانس
کاٹ کھاویں تو اچھلو دو دو بانس
پشہ وکیک اور کھٹی تھی
جن کے کاٹھے اچھلتی پتی تھی

ننھے منے جانوروں کا کچھ حال سنانے کے بعد مناسب تھا کہ میں شکار ناموں سے کچھ اشعار ایسے جانوروں کے نام لکھتا ہوں۔ کبھی کبھی ایک ہی جانور کے لئے ایک سے زیادہ لفظ ہیں، میں نے انھیں ترک نہیں کیا ہے تاکہ شاعر کے ذخیرۂ الفاظ کا کچھ اندازہ ہو سکے:

شیر؛ پلنگ؛ شیر نر؛ نمر [تیندوا]؛ ببر؛ ہاتھی؛ بکری؛ نہنگ؛ نرہ شیر؛ چیتل؛
پاڑھا؛ ارنا

[بھینسا]؛ شیر ژیاں؛ پیل
دماں؛ بھیڑ؛ شتر مرغ؛ گوزن؛ ہرن؛ کتا؛ گرگ؛ آہو؛ ہرن؛
فیل؛ گور [خر]؛ شغال؛ روباہ؛ ریچھ

مندرجہ بالا فہرست ''شکار نامۂ اول'' کے اولین چالیس اشعار سے اخذ کی گئی ہے۔
اب ''شکار نامۂ دوم'' سے ایک فہرست دیکھتے ہیں۔ غزلوں کو چھوڑ کر یہ فہرست اس مثنوی کے اولین پچپن (۵۵) اشعار پر مبنی ہے: پلنگ؛ شیر ببری؛ چکارا؛ گرگ؛ شیر؛ اسد؛ بادخور [= ہما]؛ کلنگ؛ باز؛ جرہ؛ مرغابی؛ بزا [= بکرا]؛ ارنا [بھینسا غفنفر؛ ہاتھی؛ اژدر؛ گوزن؛ گور [خر]؛ قرقرہ؛ عقاب؛ زغن؛ تغدار؛ خاز [= قاز]؛ زاغ؛ کلاغ؛ شتر مرغ؛ پلنگان مردم در؛ ہزبران خوں خوار؛ غرندہ شیرِ؛ فیلان مست؛ گینڈا؛ بھینسا؛ عصفور؛ کپی؛ لنگور؛ شاہین؛ بکری؛ گرگ کہن؛ کلنگ؛ قوچ [= مینڈھا]؛ ایل [= بارہ سنگھا] ؛ رنگ [= جنگلی بیل]؛ جرہ؛ سرخاب؛ لگ لگ؛ تیتر؛ غمخوارک [= بگلا]؛ سارس؛ قاز؛ حواصل؛ طاؤس

اگر آپ کو یہ گمان گذرے کہ یہ سب نظیر اکبر آبادی کی طرح محض فہرستیں ہیں، تو میں چند شعر ادھر ادھر سے حاضر کر دیتا ہوں۔ یہ انھیں اشعار میں ہیں جن سے فہرستیں اخذ کی گئی ہیں۔

سن آواز شیران نر ڈر گئے
پلنگ و نمر خوف سے مر گئے

جہاں ببر آیا نظر صید تھا
بیاباں اسی پہن سے قید تھا

پلنگان صحرا کے دل خوں کئے
نہنگان دریا ہوئے مرجئے

گئے بادخور آسماں میں پلٹ
کلنگوں کی صف باز نے دی الٹ

کلنگ ایسے بازوں سے آئے ستوہ
کہ کابل سے آگے گئے صد کروہ

ستوہ = اول مضموم، عاجز

کہ کابل سے آگے گئے صد کروہ
غضب کر گئے جرے نواب کے
اڑا کھا گئے خیل سرخاب کے
حواصل کو ہوتا اگر حوصلہ
تو گرتا نہ کھیتوں میں ہودہ دلہ

اب میں مثنوی ''سگ و گربہ'' اور ''مرثیۂ خروس'' کا ذکر چھوڑ کر مثنوی ''در ہجو خانۂ خود'' اور مثنوی ''در مذمت برشگال'' کا ذکر کرتا ہوں کہ معماری کی اصطلاحیں اور گھر کے مختلف حصوں اور ان کے مکینوں کے نام بھی ذرا معلوم ہو جائیں۔ مندرجۂ ذیل متفرق اشعار ''در ہجو خانۂ خود'' کے آغاز سے لئے گئے ہیں۔

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
جھاڑ باندھا ہے مینھ نے دن رات
گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات
باؤ میں کانپتی ہیں جو تھر تھر
ان پہ ردار کھے کوئی کیونکر
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے
کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا
شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے
کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ
اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کبھو کوئی سنپولیا ہے پھرے
کبھی چھت سے ہزار پائے گرے
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے
کوئی داسا کہیں سے چھوٹا ہے
دی ہیں اڑواڑیں پھر جو حد سے زیاد
چل ستوں سے مکان دے ہے یاد
کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال
پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے
برسے ہے اک خرابی گھر در سے
اکھرے پکھڑے کواڑ ٹوٹی وصید وصید = چوکھٹ
زلفی زنجیر ایک کہنہ حدید زلفی زنجیر = دروازے کی کنڈی

جی تو چاہتا ہے پوری مثنوی نقل کر ڈالوں لیکن طوالت مانع ہے۔ ''وصید'' اور ''حدید'' قافیوں کی داد تو سامنے کی بات ہے۔ ٹوٹے پھوٹے گھر کا اس سے بہتر بیان، اور وہ بھی مزاحیہ، اردو شاعری میں تو نہ ملے گا۔ معماری اصطلاحات سے واقفیت کا یہ عالم ہے کہ لگتا ہے کہ مہندس کی کتاب سامنے کھلی رکھی ہے۔

مثنوی ''در مذمت برشگال کہ باراں درآں سال بسیار شدہ بود'' محض ایک عمدہ نظم نہیں، استعاروں، نئے الفاظ، اور انوکھے پیکروں کا شاہکار ہے۔ چند متفرق شعر درج کرتا ہوں۔

لے زمیں سے ہے تا فلک غرقاب

چشمۂ آفتاب ہیں گرداب
خشک بن اب کی بار سبز ہوئے
موش دشتی کے خار سبز ہوئے — موش دشتی = ساہی
لڑکوں نے کی زمانہ سازی ہے — خاک بازی = ریت یا مٹی میں کچھ چھپا کر
خاک بازی اب آب بازی ہے — کھیل؛ آب بازی = تیراکی
آدمی ہیں سو کب نکلتے ہیں
مردم آبی پھرتے چلتے ہیں
کتے ڈوبے گئے کہاں ہیں اب
سگ آبی ہی ہیں جہاں ہیں اب — سگ آبی = Beaver
غرق ہے چڑیا اور گلہری ہے
خشکی کا جانور بھی بہری ہے

جیسا کہ میں نے ابھی کہا، یہ چند متفرق اشعار مثنوی کے شروع میں ہیں۔ ان سے پوری نظم کی خوبصورتی، ظرافت، تحرک، تنوع، اور بارش کی کثرت کا لمسی احساس نہیں ہوسکتا۔ پوری مثنوی پڑھیے تو آپ کو لگے گا کہ آپ خود پانی میں بھیگ گئے ہیں، لیکن ان چند اشعار سے یہ تو کوئی بھی دیکھ سکتا ہے کہ جانوروں سے میر کا شغف یہاں بھی واضح ہے۔ چند اور شعر نقل کئے بغیر یہاں چارہ نہیں، ان میں اشیا کا بیان دیکھئے۔

شعر کی بحر میں بھی ہے پانی
بہتی پھرتی ہے اب غزل خوانی
لائی بارندگی کی چالاکی
آب خشک گہر پہ نم ناکی
ہے زراعت جو پانی نے ماری

ہوگئی آب خست تر کاری
آب ہے گا جہاں کے سر تا سر
خوف سے سوکھتا ہے میوۂ تر
پانی عالم کے تا بہ سر ہے گا
خشک مغزوں کا مغز تر ہے گا
خضر کیونکر کے زیست کرتا ہے
آب حیواں میں پانی مرتا ہے

یہ آخری شعر تو تحسین اور تجزیے سے بے نیاز ہے، جیسے کسی بلند آبشار کی خوبصورتی اور اور موسیقیاتی شان الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی۔

میر کے تقریباً ہم عمر یا عمر میں کچھ بڑے ہم عصروں میں نظیر کی استثنائی حیثیت کو نظر انداز کریں تو سودا، درد، قائم، میر سوز ہیں۔ قائم کے سوا کسی کے یہاں جانوروں اور موسموں کا ذکر نہیں۔ اور قائم کی بھی بس ایک مختصر مثنوی موسم سرما کے بارے میں ہے جس میں مضمون آفرینی بہر حال بہت خوب ہے۔ میر کے وہ معاصر جو میر سے عمر میں چھوٹے تھے، ان میں مصحفی اور جرأت نمایاں ہیں۔ جرأت نے ایک زبردست ہجو یہ شہر آشوب ضرور لکھا ہے جس کے ہر بند میں چڑیوں یا جانوروں کا ذکر ہے۔ لیکن وہ صفت اس ہجو میں لزوم مالا یلزم کا حکم رکھتی ہے، یعنی چڑیوں اور جانوروں کے نام لینا ہجو کے نفس مطلب کے لئے ضروری نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس التزام نے جرأت کی ہجو کو نئی اور انوکھی شان بخش دی ہے۔ لیکن اسے ''جانوروں کے بارے میں نظم'' نہیں کہا جا سکتا۔ فارسی میں شیخ عطار کی شاہکار مثنوی ''منطق الطیر'' تقریباً ساری کی ساری چڑیوں کی زبان سے ہے۔ لیکن عطار کی مثنوی اور ان کے بعد مولانائے روم کی مثنوی میں جانوروں کے بارے میں خال خال حکایتیں بھی اسی لئے میر کی طرح کی نظمیں نہیں ہیں کہ انھیں کسی اور مطلب کے ادا کرنے، مثلاً سبق آموزی، یا مثال و تمثیل کے لئے نظم کیا گیا ہے۔ فارسی ہی میں انوری اور

عبید زاکانی نے جانوروں کے بارے میں حکایتیں یا حکایت نما نظمیں کہی ہیں۔ انوری کی نظمیں طنز اور ظرافت اور مختصر لفظوں میں بات پوری کرنے کے فن کا عمدہ نمونہ ہیں۔ عبید زاکانی کی فحشیات سے قطع نظر کریں تو اس کے یہاں کچھ ٹھٹھول، کچھ طنزیہ لطیفے ضرور ہیں لیکن اسے جانوروں سے کچھ محبت نہیں، جانور اس کے لئے اپنی بات کہنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور بس۔

فرانسیسی میں ہم بودلیئر (Charles Baudelaire) کا ذکر کر چکے ہیں۔ فرانسیسی شاعر ژاں دَلافونتیں (Jean de la Fontaine, 1621-1695) دنیا کا شاید واحد شاعر ہے جس کا بیشتر کلام جانوروں کی کہانیوں پر مبنی ہے۔ اس کی نظمیں بظاہر بچوں کے معیار کی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کی لطیف ظرافت، باریک نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی، برہمی اور طنز کی تیزی سے اس کی نظموں کا خالی ہونا، یہ صفات ایسی ہیں کہ اس کی ہر نظم ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اکثر نظمیں تو اس قدر لطیف ہیں کہ انگریزی میں بھی ان کا ترجمہ بے مزہ لگتا ہے۔ لیکن یہ نظمیں اس نف کی ہیں جسے انگریزی میں Fable کہتے ہیں۔ اس میں جانوروں کو انسانوں کی طرح بات چیت کرتے دکھایا جاتا ہے۔ یہ نظمیں دراصل حیات انسانی کے بارے میں تمثیلیں ہیں، جانوروں کے بارے میں نظمیں نہیں ہیں۔

مصحفی کے یہاں البتہ بعض مثنویاں جانوروں اور اشیا اور موسموں کے بارے میں ہیں۔ بلکہ یوں کہیں کہ ان کی ایک مثنوی اجوائن کی مدح میں ہے جو بہت خوب ہے۔ اس کے سوا جانوروں کے بارے میں کچھ مثنویاں ہیں جو زیادہ تر انھوں نے اپنے گھر میں کام کرنے والی عورت بی بولن کی خاطر کہی ہیں۔ کچھ مثنویاں اور بھی ہیں جو موسموں کے بارے میں ہیں۔ ایک مثنوی کھٹملوں پر ہے۔ مصحفی کے دیوان دوم کی اس مثنوی سے چند اشعار نقل کرتا ہوں، کیونکہ میر نے بھی کھٹملوں کا ذکر کیا ہے۔ مصحفی کہتے ہیں ؎

آخرش شام سے ہو شب بیدار
کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار

مارے جو موٹے موٹے چن چن کر

چھینٹ کا تھان بن گئی چادر

گھسے دیوار پر جو کر کے تلاش

کر دیا گھر کو خانۂ نقاش

نہیں مرتے ہیں تو بھی یہ بدذات

کیا انھوں نے پیا ہے آب حیات

اس میں کوئی شک نہیں کہ ظرافت، جھنجھلاہٹ، بےچینی کی مضمون آفرینی، ہر چیز کے اظہار کے لئے یہ شعر اس وقت تک اعلیٰ نمونہ قرار دیئے جا سکتے ہیں جب تک آپ نے میر کو نہ پڑھا ہو۔ اب میر کی مثنوی ''در ہجو خانۂ خود'' کے یہ متفرق شعر ملاحظہ کریں۔

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ

پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی

چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں

سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں

کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے

سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر

ایک انگوٹھا دکھاوے انگلی پر

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا

پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

اور بھی شعر ہیں لیکن طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر کے یہاں خوش طبعی اور طباعی زیادہ ہے اور مناسبت الفاظ بھی مصحفی سے بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن ان معاملات میں میر کے حریف مصحفی بہر حال ہیں۔ اب میر کے ''شکار نامۂ اول'' سے برسات اور سردی کے جو شعر میں اوپر نقل کر آیا ہوں انھیں ذہن میں لائیے اور مصحفی کو سنئے (دیوان دوم)۔

طرفہ سردی ہے ان دنوں یارب
جس کے ڈر سے گلیم پوش ہے شب
سنگ و آہن جواب بہم ہوں دو چار
برف ان سے جھڑے بجائے شرار
دیکھیو شدت شب سرما
بن بجھائے چراغ ہے ٹھنڈا
جس طرف دیکھو آگ کی ہے پکار
آگ کیا اک خدا کا ہے دیدار

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مصحفی کے ان شعروں میں مضمون آفرینی، بلکہ خیال بندی بہت خوب ہے، لیکن سردی کا وہ احساس نہیں جو میر کے دو ہی شعروں میں جاگ اٹھتا ہے۔

پھرے باد سے لوگ منھ ڈھانپتے
جگر چھاتیوں میں رہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کیدھر شکار
ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار

قائم چاندپوری کی مثنوی ''در ہجو شدت سرما'' میں بھی مضمون آفرینی مصحفی جیسی ہے۔

ان دنوں چرخ پر نہیں ہے مہر
گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر

پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے
سبزہ وہ شال کی رضائی ہے
بس کہ یخ بستہ بحر بیچ ہے آب
برف کی ہے رکابی ہر گرداب

یہ شعر بھی مصحفی کے اشعار کی طرح پر لطف ہیں لیکن محسوسات کی جگہ خیال، یعنی کیفیت کے انبساط کی جگہ عقل کا پھیلاؤ ہے۔ خیال بندی میں انبساط اور فرحت ممکن ہے، لیکن غزل میں۔ غالب، ناسخ، آتش، ذوق، شاہ نصیر، آتش، نسیم دہلوی، وغیرہ کے اشعار اس کی دلیل ہیں۔ لیکن جہاں براہ راست محسوسات کا معاملہ ہو، اور وہ بھی روزمرہ زندگی کے مناظر اور تجربات کے بیان میں، وہاں خیال بندی تعقلاتی لطف تو پیدا کرتی ہے لیکن کیفیت اور جذباتی انبساط کم ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا، میر کے اشعار میں جانور جب روزانہ زندگی کا حصہ بن کر آتے ہیں تو ان میں انسانی صفات اور خصائص کا بھی رنگ آجاتا ہے۔ جانوروں کے بیان میں میر کے اتباع میں مصحفی کچھ بہت دور نہیں جا سکے ہیں۔ لیکن وہ جانور کو کارآمد شے بھی سمجھتے ہیں، یعنی جانور میں اگر کچھ شخصیت یا انسان پن ہے تو بھی وہ انسان کے لئے کارآمد ہونے کی سطح سے برتر نہیں ہے۔ مثلاً اپنی مثنوی ''درصفت بز'' (دیوان چہارم) میں مصحفی یوں رطب اللسان ہوتے ہیں۔

ہر ادا میں ہے اس کی محبوبی
بز میں دیکھی نہیں بہ ایں خوبی
کیا شجاعت کی اس کے لکھوں بات
ہے مقابل وہ شیر کے دن رات

لیکن مثنوی کے ختم ہوتے ہوتے مصحفی اپنا ''انسان پن'' ظاہر ہی کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

مثل پور خلیل لاثانی
مستعد ہے برائے قربانی

ہے فدائے وہ خنجر تسلیم
ذبح ہونے سے اس کو کیا ہے بیم

بے شک دونوں شعرا اچھے ہیں۔ لیکن جس کی ہر ادا میں محبوبی ہو، اس کی گردن کٹنے کی بات کرنے، بلکہ گردن کٹنے کی توقع رکھنے کو ''انسان پن'' نہ کہیں تو کیا کہیں گے؟ اب مصحفی کے برخلاف میر کو دیکھئے، مثنوی ''در بیان بز'' میں کہتے ہیں ؎

کہتے ہیں جو غم نہ داری بز بخر
سو ہی لی میں ایک بکری ڈھونڈ کر
شعر زور طبع سے کہتا ہوں چار
دزدی بز گیری نہیں اپنا شعار — بز گیری = چوری؛ مکر و حیلہ کرنا
دزد ہے شائستہ خوں ریزی کایاں
بلکہ بابت ہے بز آویزی کایاں — بز آویزی = ذبح کر کے الٹا لٹکانا، جس طرح قصاب کرتے ہیں
میں پڑھوں ہوں اس کے آگے شعر گہ
اپنے ہاں گویا بز اخفش ہے یہ

نظم کی اٹھان دیکھئے: میں نے ایک بکری خریدی ہے، چرائی نہیں۔ چوری، حیلہ گری اپنا شعار نہیں۔ بلکہ میری نظر میں تو چور واجب القتل ہے، بلکہ اس لائق ہے کہ اسے بکرے کی طرح ذبح کر کے الٹا لکایا جائے۔ میں اس کے سامنے اپنے شعر پڑھتا ہوں، جس طرح اخفش کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اپنی کتاب کے اوراق اپنے بکرے کو سناتا، اور جب بکرا سر ہلا دیتا تب وہ ان اوراق کو کتاب میں باقی رکھتا۔ اگلا شعر سنئے ؎

بکروں کی داڑھی کے تیں جانے ہیں سب
تکہ ریشی بکری کی ہے بوالعجب — تکہ = بضم اول، بکرا

اب الفاظ ملاحظہ ہوں: بز گیری، بز آویزی، تکہ ریشی، ایسے الفاظ مصحفی تو کیا سودا کو بھی

نہ سوجھ سکتے ہوں گے۔اب سراپا دیکھئے۔

رنگ سر سے پاؤں تک اس کا سیاہ
چکنی ایسی جس پہ کم ٹھہرے نگاہ
چار پستان اس کے آئے دید میں
دو جہاں ہوتے ہیں دو ہیں جید میں

جید=گردن

''دید'' کا قافیہ ''جید'' مولانا روم جیسے مثنوی نگار کو سوجھتا تو وہ بھی خوش ہوتے۔خیر، اس کے دو بچے ہوئے اور بڑے ناز سے پالے پوسے گئے۔

زور وقوت سے حریفوں کے ہیں ڈھینگ
آہوے جنگی کو دکھلاتے ہیں سینگ

ڈھینگ=لمبا، زور آور
جنگی=بے وجہ جھگڑنے والا

ٹکران کی کیا جگر مینڈھا اٹھائے
قوچ سرزن سامنے ہرگز نہ آئے
تیس ان کی دھاک سن کر مر گیا

تیس=اول مفتوح=بکرا یا نر
آہو جو اپنے گلے کا نگہبان ہوتا ہے

غم گوزنوں کو انھوں کا چر گیا

ان خوبیوں کے باوجود میر کو ان کا ذبح ہونا گوارا ہے، کیونکہ ان کی خوبیاں سب جانورانہ ہیں۔بکری کے ذبح ہونے کا البتہ کوئی مذکور نہیں۔اور ان بکروں کے لئے بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ اب میں نے ان کے پاس جانا چھوڑ دیا ہے، کاش وہ اس طرح میری آغوش کے پروردہ نہ ہوتے۔

پاس جانا ان کے اب مسدود ہے
ذبح کرنے کو ہر اک موجود ہے

میر کے برخلاف مصحفی کی بکری، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ع

مستعد ہے برائے قربانی

مصحفی کا مینڈھا بھی بچارا اسی تذبیر کا مارا ہوا ہے۔''مثنوی قوچ کہ بزبان ہندی مینڈھا می گویند''

(دیوان چہارم) میں مصحفی کہتے ہیں کہ اس میں سب خوبیاں ہیں، وہ بھی بچپن سے مصحفی کے گھر میں پلا ہوا ہے اور آزاد پھرتا ہے۔ مصحفی اس کی پیدائش کو ''نزول فرشتۂ رحمت'' قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کی تقدیر یہ ہے کہ ؎

ہے یہ وصف دویم کہ یہ حیواں
نہیں کرتا بوقت ذبح فغاں
یعنی شکوے کے لب ہیں اس کے بند
نہیں بانگ اس کی بز کی طرح بلند
ہے زبس واقف مقام رضا
جی سے عاشق ہے اس کی تیغ قضا

بچارے مینڈھے میں انسانی صفت صرف ایک ہے ع

اس نے آپ اپنا خوں کیا ہے بحل

مصحفی کی مسماۃ بولن نے طوطا پالا تو وہ بھاگ نکلا، یعنی بے وفا ثابت ہوا۔ دوسری مثنوی میں جو طوطا ہے وہ بھی بی بولن نے پالا تھا اور وہ مثنوی کے اختتام تک موجود تھا لیکن اس میں طوطے کی جتنی توصیف ہے وہ اس کی جانورانہ حیثیت کو پیش نظر رکھ کر نظم کی گئی ہے۔ (دونوں مثنویاں دیوان چہارم میں ہیں۔) اس کے برخلاف، میر نے جو مرغا پالا تھا وہ عام مرغوں سے بالکل مختلف جگردار تھا۔

بجز کنارہ نہ سیمرغ کو بنا چارہ
کہ فیل مرغ کو بکری کی طرح سے مارا
خصومت اس کی تھی یک مادہ سگ سے شام و سحر
کبھو وہ لات اسے مارتا کبھو شہپر
قضا جو پہنچی تھی نزدیک وہ بھی جھنجھلائی

حریف ہو کے دلیرانہ سامنے آئی

بالآخر مرغاموت کے گھاٹ اتر ہی گیا۔لیکن اس کے غم میں ؎

ہوا کے مرغ ہوئے داغ اس کے ماتم سے

سیاہ پوش رہے طائر حرم غم سے

وہاں جو نوحۂ مرغان قدس باز ہوا

کہ مرغ قبلہ نما کا بھی دل گداز ہوا

خروس عرش ہی اس بن نہیں ہے سینہ فگار

خروس عرش = وہ مرغا جو آسمان پر قیام پذیر ہے اور سب سے پہلی بانگ سحر وہی دیتا ہے۔دوسرے مرغے اس کی بانگ سن کر پکارنا شروع کرتے ہیں

ہزار مرغ کا اب گھر خروس پر ہے بار

خانہ برخروس بار بودن = ویران ہونا

مثنوی کا آخری شعر ہے ؎

خموش میر تجھی کو نہیں یہ رنج وتعب

کباب آتش غم میں ہیں مرغ وماہی سب

اس جنگجو مرغے کے بیان میں مناسبات لفظی کی کثرت کا ذکر نہ کر کے میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ اس چوبیس شعر کی مثنوی میں اکتیس جانوروں کے نام یا ان کے تلازمے آئے ہیں:

خروس؛ خروس عرش؛ مرغ انداز کرنا؛ مرغ مصلی؛ مرغ خیال؛ مرغ زریں بال؛ مرغ آتش خوار؛

بطخ؛ مرغ سبزوار؛ قاز؛ کلنگ؛ شتر دلی؛ شتر مرغ؛ مرغا؛ حواصل؛ سیمرغ؛ فیل مرغ؛ بکری؛ گربہ؛ سگ؛ مادہ سگ؛ ہدہد؛ ہوا کے مرغ؛ طائر حرم؛ مرغان قدس؛ مرغ قبلہ نما؛ مرغ قفس؛ طیور؛ مرغ

دست آموز؛ مرغ خانگی؛ ماہی

بھلا سوچیے، کیا سودا، کیا نظیر، کیا قائم، کیا جرأت، کیا مصحفی، ان میں سے کس کو مناسبات لفظی، رعایت لفظی و معنوی، معنی کے وفور، اور نادر الفاظ پر اس قدر دسترس ہے۔ اس بات کو تو الگ ہی رکھئے کہ جانوروں کے تئیں میر کا رویہ کس قدر روشن دلانہ اور یک دردی (Empathy) سے کس قدر بھرپور ہے۔ صرف شکار ناموں میں میر نے جانوروں کو محض شکار، یا انسانی اقتدار اور اہلیت کے سامنے صید زبوں دکھایا ہے اور ان کی موت یا بے گھری پر کسی ناپسندیدگی یا رنج کا اظہار نہیں کیا ہے۔ لیکن شکار نامہ پھر شکار نامہ ہے۔ وہاں جانوروں کا قتل عام تو لازم ہی ہے، بلکہ یہ اس کی رسومیات میں داخل ہے۔ لہٰذا میر یہاں اپنے جذبۂ یک دردی کو معطل رکھتے ہیں۔ ابھی تو آپ یہ دیکھئے کہ دیہات ہو یا شہر، میر کی نظر جانوروں اور ان کی حرکتوں پر بے محابا پڑتی ہے اور ان کے یہاں جانور، انسان، اشیا، یہ سب ایک ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ''تسنگ نامہ'' میں کتوں، انسانوں، اور اشیا کے بارے میں معجز کلامیاں دیکھئے۔

پانی پانی تھا شور سے طوفان
دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان
ہمرہ موج سینکڑوں گرداب
ساتھ تھی صدتری کے چشم حباب
ناؤ میں پاؤں ہم نے بارے رکھا
خوف کو جان کے کنارے رکھا
جز رو مد سب حواس کھوتا تھا
خضر کا رنگ سبز ہوتا تھا

مناسبت اور استعاروں کو کہاں تک واضح کروں، یہاں طوفان پانی پانی ہوتا ہے، دریا کو دیکھ کر جان سوکھتی ہے، حباب کی آنکھ تر ہے، یہاں پر لوگ ڈوب کر جان دینے کے خوف کو دریا کنارے رکھتے ہیں، یا جان بوجھ کر خوف کو کنارے پر رکھتے اور جان کا خطرہ مول لیتے ہیں۔

یہاں پانی کے خوف اور sea-sickness یعنی ناخوشی دریا کے باعث حضرت خضر (خضر کے معنی ''سبز'' ہیں) کو گرانی سر اور متلی ہے اور ان کا رنگ سبز پڑ گیا ہے، یعنی سیاہی مائل ہو گیا ہے۔ لیکن اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ یہ تجربے انسانی ہیں، یعنی متکلم کے ہیں، یعنی یہاں انسانی احساس کا بیان ہے، ''حقیقت'' یہاں بہت اہم نہیں۔ خیر، اب دریا کے پار کا منظر دیکھتے ہیں ؎

سو نہ جا گہ تھی نے مکان مبیت — مبیت = رات گذارنے کے لائق
چار دو کانیں ایک پھوٹی مسیت
جا کے حیراں ہوئے کدھر جاویں
سر گھسیڑیں جو ٹک جگہ پاویں
تگ و دو ہر طرف لگے کرنے
تس پہ پڑتے تھے مینھ کے بھرنے — بھرنے پڑنا = زور کی بارش ہونا
کوئی میداں میں کوئی چھپر میں
کوئی در میں کوئی کسو گھر میں
گھر ملا صاحبوں کو ایسا تنگ
جس سے بیت الخلا کو آوے ننگ

میرا خیال تھا کہ میں اشیا کا ذکر کروں گا کہ میر کی نگاہ کتنی باریک ہے، لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ گھر کے لئے ''بیت الخلا'' کا لفظ لانا، جس کے لغوی معنی ہیں، ''تنہائی کا گھر''، اور پھر ''ننگ'' کا لفظ رکھنا، کہ بیت الخلا میں لوگ کپڑے اتارتے ہیں، زبان پر ایسی خلاقانہ قدرت کا مظاہرہ ہے کہ اس پر شیکسپیئر بھی رشک کرتا۔ خیر، اب اشیا کو دیکھئے: مکان بمعنی جگہ، اور مکان بمعنی گھر؛ چار یعنی بہت کم؛ دو کانیں؛ مسجد (لفظ ''مسیت'' داد سے مستغنی ہے)، وہ بھی ٹوٹی پھوٹی؛ سر گھسیڑنے کے لئے جگہ؛ بارش کی بھرن؛ میدان؛ در؛ چھپر؛ ان چند چھوٹی موٹی باتوں میں سارا منظر بیان ہو گیا ہے۔ اب ذرا اس بستی کے کتوں سے مل دیکھئے ؎

کتوں کے چاروں اور رستے تھے
کتے ہی واں کہے تو بستے تھے
دو کہیں ہیں کھڑے کہیں بیٹھے
چار لوگوں کے گھر میں ہیں پیٹھے
ایک نے پھوڑے باسن ایکو نے
کھود مارے گھروں کے سب کو نے
گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے
روٹی ٹکڑے کی بو پہ گرنے لگے
ایک نے آ کے دیگچہ چاٹا
ایک آیا سو کھا گیا آٹا
ایک نے دوڑ کر دیا پھوڑا
پھر پیا آ کے تیل اگر چھوڑا

☆

باہر اندر کہاں کہاں کتے
بام و در چھت جہاں تہاں کتے
جھڑ جھڑاوے ہے کان کو کوئی
روووے ہے اپنی جان کو کوئی
یک طرف ہے چپڑ چپڑ کی صدا
یعنی کتا ہے چکی چاٹ رہا
ایک چھنے کو منھ میں لے آیا
ایک چولھے کو کھودتا پایا

ایک کے منھ میں ہانڈی ہے کالی
ایک نے چلنی چاٹ ہے ڈالی
تیل کی کپی ایک لے بھاگا
ایک چکنے گھڑے سے جالاگا

کتوں کو فی الحال نظر انداز کیجئے، لیکن پطرس کا مضمون ''کتے'' ضرور ذہن میں لائیے کہ پطرس اور میر ایک ہی رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ اب اشیا کو شمار کیجئے:

رستے؛ گھر؛ باسن؛ گھروں کے کونے؛ روٹی؛ ٹکڑا؛ دیگچہ؛ آٹا؛ دیا؛ تیل؛ بام؛ در؛ چھت؛ جھڑ جھڑاتا ہوا کان؛ چکی؛ چھنا؛ چولھا؛ کالی ہانڈی؛ چلنی؛ تیل کی کپی؛ چکنا گھڑا

ان اشعار میں کئی طرح کی چالاکیاں بھی ہیں، مثلاً حرکی اور سمعی پیکروں کی فراوانی، تجنیس حرفی، تجنیس صوتی وغیرہ، لیکن ان پر گفتگو کا موقع اس وقت نہیں، صرف اشارہ کافی ہے۔ یہاں اس بات پر غور کریں کہ بارہ شعر اور اکیس اشیا، اور سب کی سب معمولی گھریلو چیزیں۔ اور دوسری بات یہ کہ ظرافت کے ساتھ ہلکی سی جھنجھلاہٹ یا بیزاری ضرور ہے، لیکن کتوں کے خلاف کوئی کینہ یا برہمی نہیں۔ کم وبیش ایسا انداز ہے گویا کسی ڈھیٹ بچے کی شرارتیں بیان ہو رہی ہوں۔ کچھ ایسا ہی انداز پطرس کے مضمون میں بھی ہے۔ یہ فیصلہ نقادان فن پر چھوڑتا ہوں کہ میر جدید ہیں یا پطرس قدیم؟

اب مثنوی ''کدخدائی بشن سنگھ'' سے کچھ بہار یہ اشعار پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

چل ہوائی سے شعلہ خیزی دیکھ
آسماں کی ستارہ ریزی دیکھ
متصل چھوٹتے جو ہیں گے انار
راہ ورستے ہوئے ہیں باغ وبہار

عشق ہے تازہ کار آتش باز
پھول گل میں ہے رنگ رنگ اعجاز
دیکھ صنعت گری صنعت گر
گل کاغذ ہے غیرت گل تر

پیکر، استعارہ، مناسبت الفاظ، چھوٹی چھوٹی اشیا سے شغف اور ان کو بڑی چیز بنا دینا (مثلاً عشق کو ''آتش باز'' کہنا، کہ آتش بازی معمولی بات ہے اور عشق بڑی بات، لیکن یہاں ان کا جوڑ کس قدر خوبصورت ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔) جانور، اشیا، زندگی سے شغف، زبان پر ایسی مہارت کہ حد سحر کو بھی پار کر جائے، ان سب باتوں میں شیکسپیئر اور میر ہم پلہ ہیں۔

مثنوی کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی میر کے یہاں بہت کچھ ہے۔ ہجویں اور خود نوشتی نظمیں بھی ہماری توجہ کی طالب ہیں۔ نادر الفاظ (خواہ فارسی عربی، خواہ اردو) کی جلوہ گری دیکھنا ہو تو مرثیے ملاحظہ ہوں۔ جزئیات سے میر کا شغف بھی ہر جگہ نمایاں ہے۔ لیکن میری گفتگو یوں ہی بہت طویل ہو چکی ہے۔ بقول میر (دیوان پنجم)۔

اس صنائع کا اس بدائع کا
کچھ تعجب نہیں خدائی ہے

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

میر تقی میرؔ

ایک مختصر لسانی و نفسیاتی جائزہ

بظاہر یہ شعر ایک سامنے کا شعر ہے۔ اس میں ایسی کوئی تہہ داری بھی نہیں، ایسی کوئی طرح داری بھی نہیں کہ قاری اس کے متن پر چونکے، سر دھنے۔ اِدھر شروع ہوئی اور ادھر ختم ہوگئی۔ نہ کہیں کوئی شوشہ ہے اور نہ کہیں کوئی ٹھہراؤ۔ جی چاہے تو دوسرے مصرع میں ''جا'' کے بعد ایک پل کے لئے توقف کر لیجئے۔ یوں کہئے کہ سرسری سا متن ہے اور سادہ سادہ سا طرز بیان جنہیں میرؔ صاحب نے کسی تردّد یا تکلف سے الجھے بغیر، اپنی مشقِ سخن بروئے کار لاتے ہوئے قاری کے سامنے یہ کہکر پیش کر دیا۔ ''شعر حاضر ہے''۔ اور آگے بڑھ گئے۔ اس طرح فہم سے اس شعر میں نکتہ سنجی کی نشان دہی قاری کی ذمہ داری ٹھہری۔ وہ یوں کہ میرؔ صاحب کا اسلوب تکمیل مضمون کی نہیں تشنگیٔ مضمون کی دلالت کرتا ہے۔ زبان کی روانی اور دسترس کے باعث قاری پوچھتا ہی رہ جاتا ہے۔ ''یہ آمد ہے یا آورد؟'' مفاہیم میں پنہاں تسلسل اور ہمہ رنگی خود اعلان کرتے ہیں کہ یہ شعر شعرِ میرؔ ہے۔

اسی اعلان کو اساس بنایئے اور اس شعر کا منظر تج کر پس منظر، ژرف نگاہی سے دیکھنے کی سعی کیجئے تاکہ مجوزہ متن کی تہہ داری اپنے وجود کا جواز فراہم کرے۔

اس شعر کا لفظیاتی خاکہ ''گزرے تھا'' ماضی سے منسوب ہے جب کہ دوسرے مصرع کا آخری لفظ ''تھا'' کو لفظ ''ہے'' سے بدل کر فعلِ حال میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ یوں ''گزرنے'' کا عمل جاری و ساری ہو جاتا ہے اور ہر زمانے پر صادق آتا۔ نیز اسی مصرع میں لفظ 'جا' کو آگے بڑھا

پروفیسر مامون ایمن، نیویارک، یو۔ ایس۔ اے۔

کر ''جہاں'' کہا گیا ایک صفت ''دیگر'' کے ساتھ۔ دونوں مصرعوں میں لفظ ''جہاں کی تکرار ہے۔ ان میں فرق صرف یہ ہے پہلے مصرع مین یہ لفظ مفرد ہے اور دوسرے مصرع میں اسے مرکبِ اضافی کے ساتھ باندھا گیا ہے۔ پہلے مصرع میں فعل ''گزرے'' ایک صفت ''سرسری'' سے مربوط ہے۔ نیز دوسرے مصرع میں لفظ ''ورنہ'' کی حیثیت ایک ''شرط'' کی پر۔ زبان کے ضمن میں لفظ ''تم'' خاص توجہ چاہتا ہے کہ اس کی درجہ بندی تعین سے عاری ہے۔ کیا یہ لفظ ''خود کلامی'' کے ضمن میں آتا ہے۔ یعنی ''آپ بیتی'' یا اس کا مخاطب شاعر نہیں کوئی اور ہے کون؟ دنیا، زمانہ، افراد۔ یہ مخاطب ماضی کا حصّہ ہے تو اس کا عہد کون سا ہے؟ دوسرے مصرع میں لفظ ''ہر'' کی حیثیت اجتماعی ہے جب کہ لفظ ''جہان'' دونوں مصرعوں میں واحد ہے۔ مختصر اً یہ کہئے کہ الفاظ ''سرسری، تم، دیگر'' اس شعر کو دوبارہ کئی بار پڑھنے اور سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی دعوت ہمیں باور کراتی ہے کہ یہ شعر میرؔ صاحب ہی کا ہے۔

لفظ ''سرسری'' کا یہ رخ ''سننے'' کے حوالہ سے بھی دیکھئے۔

سرسری کچھ سن لیا پھر واہ واکرا اٹھے
شعر یہ کم فہم سمجھے ہیں خیالِ بنگ ہے

''کم فہم'' کے ساتھ ''خیالِ بنگ'' کا استعمال سوالات کی وجہ بنتا ہے۔ ''کون، کیوں، کیسے، کہاں'' اس شعر میں احباب تخاطب کی وضاحت ضروری نہیں۔ ہاں لفظ ''بنگ'' (بھنگ، حشیش) میں استہزاء کے ساتھ ساتھ طنز اور مزاح کے یک جان چھینٹے بھی ہیں۔

آیندہ شعر میں مخاطَب بھی ہے اور مخاطِب بھی۔ اس میں متن کی حد بندی ہے، تفریق اور تخصیص کے عناصر کے ساتھ۔

منزل نہ کر جہاں کو کہ ہم نے سفر سے آ
جس کا لیا سراغ سناوے گزر گئے

میرؔ صاحب دیکھنے اور سننے کے عوامل تج کر خود کو گھر کی چہار دیواری میں رکھنا چاہتے ہیں۔شاید۔

میرؔ صاحب کو دیکھیے جو بنے
اب بہت گھر سے کم نکلتے ہیں

اس صورتِ حال میں گرفتار شخص ماحول کا نظارہ نہیں ،اپنے سائے کی معیّت میں اپنا مطالعہ کرتا ہے ۔ اس مطالعہ کا ایک اور نام بھی ہے۔ خود کلامی۔ اس خود کلامی کے زاویے مختلف النوع ہیں مثلاً سرگوشیاں ، آوازیں ، خاموشی ، دست برداری، سکوت ، یکسوئی اور ذات و ماحول سے لاتعلقی۔ وہی چچا غالبؔ والی بات۔ ''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں لئے ہوئے'' اس مصرع کا لفظ ''جاناں'' محبوب رمحبوبہ کا معنی تو ادا کرتا ہے لیکن اس معنی میں بھی ایسی ایسی تہہ داری ہے کہ وضاحت کا دامن پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ ہمہ جہتی کے باعث کسی مقام پر نہ ذہن ٹھہرتا ہے، نہ دل اور نظر۔ احساسات اور جذبات کی وسعتیں بھی الگ ہیں۔ یہی عالم اشاروں اور کنایوں میں دکھائی دیتا ہے۔ نیز توقعات، امیدوں ، آرزوؤں ،تمناؤں اور خوابوں وغیرہم کی بھی اپنی اپنی دنیائیں ہیں۔اس مخصوص کیفیت سے مربوط اثرات اور ردِ ہائے عمل صرف تجربے کی زینت بنتے ہیں۔دنیا اس زینت کی تماشائی بنتی ہے۔ یوں تجربات بھی اور مشاہدات بھی ان جانے پردوں ، راز کے پردوں میں چھپ جاتے ہیں لیکن پوری طرح نہیں تا کہ جذبۂ دید کی تشنگی کو تکملہ کی دعوت ملتی رہے۔ اس دعوت کے تسلسل میں قرار نہیں ، بے قراری ہے۔ یہی بے قراری اس دعوت کو قرار کا مخزن بناتی ہے کہ اس مخزن کی مدد میں داخل ہونے والا فرد خود کو دنیا کا نہیں ، اپنی ذات کا تابع پاتا ہے۔ بلاشبہ یہ اتباع وہ زنجیر ہے جس میں جکڑا فرد خود کو آزاد پاتا ہے۔ یہ آزادی بھی چند خوش قسمتوں کا مقدر بنتی ہے۔ احتسابِ ذات کی منزل پر پہنچ جانے والے خوش قسمت مسافروں کا مقدر۔ یاد رہے کہ یہ مقدر عام نہیں۔ یہ مقدر میرؔ صاحب کی ذہنی زندگی کا حصّہ بھی ہے اور طبعی زندگی کا حصّہ بھی۔ وہ اس دنیا کو دنیا کی نظر سے نہیں ، اپنی نظر سے دیکھنا مقدم جانتے اور مانتے ہیں ، اس پر پورا پورا یقین

رکھتے ہیں اور اپنے مشاہدات کو برحق سمجھتے ہوئے ان کا اعلان کسی جھجک، تذبذب اور تامّل کے بغیر، برجستہ طور پر یوں کرتے ہیں کہ ان کی پسند یا ناپسند جگ پر واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس شعر میں دلّی کو 'ہفت اقلیم' کہنا میرؔ صاحب ہی کا حصّہ ہے۔

ہفت اقلیم ہر گلی ہے یہاں
دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

اس شعر کے پہلے مصرع میں لفظ 'ہفت' کا معنی تو صاف ہے یعنی ''سات'' ہاں لفظ ''اقلیم'' لغوی معنی موجود ہونے کے باوجود قاری کو مجوزہ معنی سے آگے جانے کی ترغیب دلاتا ہے۔ مثلاً یہ ''موسم'' بھی ہے، ''ملک'' بھی ہے اور ''تمام'' بھی۔ اغلب تو یہی ہے کہ میرؔ صاحب ہر گلی کو پوری دنیا قرار دیتے ہوں۔ بہ الفاظِ دیگر، وہ اپنی گلی کو پوری دنیا قرار دیتے ہوں۔ اس ضمن میں لفظ 'ملک' کو لفظ ''اقلیم'' سے مربوط کرنا شاید اس لئے درست نہ ہو کہ اس میں حد بندی ہے۔ شعر میں حد بندی مستحسن نہیں سمجھی جاتی اور پھر میرؔ صاحب تو خدائے سخن ہیں وہ اس خفیف سقم کو اپنے شعر کا حصّہ کیوں بنائیں گے، غیر شعوری طور پر بھی۔ دوسرے مصرع میں لفظ ''دلّی'' واحد ہے لیکن لفظ ''دیار'' واحد ہونے کے باوجود جمع کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ مصرع الفاظ ''ہوتے ہیں'' پر ختم ہوتا ہے۔ اگر اس مصرع میں لفظ ''دیار'' کو بطور واحد پیش کرنا ہوتا تو آخری الفاظ ''ہوتا ہے'' ہوتے۔ یوں کہئے کہ الفاظ ''گلی، دلّی'' واحد ہونے کے باوجود اپنے معانی میں اجتماعیت پروئے نظر آتے ہیں۔ میرؔ صاحب (اپنی) گلی اور دلی کو دیکھتے ہیں تو انھیں پوری دنیا سے تعبیر کرتے ہیں کہ وہ خود کو زمانہ کو اور ماحول کو اپنی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، غیروں کی نگاہوں سے نہیں کہ یہی ان کی زندگی ہے اور یہی ان کی زندگی کا شیوہ بھی ہے اور فلسفہ بھی۔

میرؔ صاحب کی اس رباعی میں منظر اور پس منظر یک جا ہیں۔

ہر روز نیا ایک تماشا دیکھا
ہر کوچہ میں سو جوانِ رعنا دیکھا

دلّی تھی طلسمات کہ ہر جا گہہ میرؔ!
ان آنکھوں سے آہ ہم نے کیا کیا دیکھا

اس رباعی میں واحد الفاظ بھی ہیں اور جمع الفاظ بھی، مثلاً ''روز، تماشا، کوچہ، جوان، دلّی، جا گہہ''۔ ''طلسمات، آنکھوں'' نیز صفات جوان، نیا بھی موجود ہیں۔ الفاظ ''تماشا''، دلّی، جا گہہ'' میں تعیّن کے معانی ہیں۔ جب کہ الفاظ طلسمات کیا کیا'' آنکھوں کو حدود سے بھی آگے۔ خود ساختہ خوابوں اور مفاہیم کی تلاش کے لئے وجدان پر اکساتے ہیں۔ یہ وجدان حدود کی کارفرمائی سے مبرّا ہوسکتا ہے۔ اس وجدان میں اِثبات یا انکار کی شرط ہے اور نہ قدغن۔ اس میں تعمیر وتخریب، سرخ روئی و بدنامی، جزا وسزا، امید ونومید اور خوشی وغم ایک ساتھ متوازی انداز میں سفر کرتے ہیں۔ اس سفر میں قدم شاذ ہی ایک دوسرے کا منھ چومتے ہوں۔ اس میں قرار بھی بے قراری ہی کا پیامی ہے۔

ہر ذرّہ خاک تیری گلی کی ہے بے قرار
یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رُل گیا

ہائے ہائے، ذرا میرؔ صاحب کی ژرف نگاہی ملاحظہ بھی کیجئے اور اس پر جی کھول کر داد بھی دیجئے۔ موصوف نے گلی کی نسبت سے پہلے لفظ ''ذرہ'' باندھا اور پھر فوراً ہی لفظ ''خاک'' کی جانب لپکے کہ ذرہ اور خاک کا مقدر اڑنا ہے، بھٹکنا ہے، دربدر مارا مارا پھرنا ہے۔ ان کا مقدر بے قراری ہے۔ یہ بے قراری لامعنی، بے مقصد اور بے وجہ نہیں کہ کوئی ستم زدہ ماٹی میں رُل کر قرار کا مرہون ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ میرؔ صاحب اپنی انفرادیت بچانے کے لئے تارک الدنیا ہو گئے ہوں۔ ان کے شب وروز کا ربط امراء سے بھی ہے اور حکام سے بھی، شاہوں سے بھی اور گداؤں سے بھی، صوفیا سے بھی اور خانقاہوں سے بھی، عوام سے بھی اور خواص سے بھی۔ ان کی شہرت دلّی، اکبرآباد، فرخ آباد، لکھنو یا اودھ تک محدود نہیں۔ اس ضمن میں دکن کا نام بھی آتا ہے۔ وہ کس ''وادی، آبادی'' میں مشہور نہیں؟ شاعرانہ تعلّی اور شخصی انا ایک طرف میرؔ صاحب کی شاعری معتبر بھی تھی اور

معترف بھی۔ وہ اس اعتبار سے بھی اور اس اعتراف سے بھی واقف تھے، خوب واقف تھے اور ان پر خوب نازاں وفرماں تھے۔ یہ، کیفیات مجرّد نہ تھیں۔ فطری طور پر ان کیفیات میں خوشیاں ہیں، صرف خوشیاں لیکن وہ ان خوشیوں کو جہانِ دیگر کہتے ہوئے ''لوہو، غم'' کا نام دیتے ہیں۔

کیا کہیں میرؔ جی ہم تم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں، لوہو پیا کرتے ہیں

اپنی گرفتہ مزاجی رخود پسندی کے باوجود وہ سوداؔ اور سوزؔ ایسے مقتدر شعراء کی موجودگی میں بھی داد وتوصیف سے خوب نوازے گئے۔ وہ تواضع، مدارات اور مہمان داری کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ تنہائی پسند ہونے کے باوجود انھوں نے ادبی مجالس اور شعری محافل سے دوری اختیار نہ کی۔ دہلی کو لکھنؤ پر ترجیح دی اور ماضی کو حال پر مقدّم جانا۔ یہ امور ''سرسری'' نہیں کہے جاسکتے۔ نیز انھیں جہانِ دگر سے منسوب کرنا بھی مناسب نہ ہوگا۔

میرؔ صاحب تنک مزاج بھی ہیں، مغرور بھی ہیں اور کبر کے مارے بھی ہیں۔ دنیا نے انھیں جیسا دیکھا، جیسا برتا اور جیسا پرکھا ویسا ہی لکھ دیا، ویسا ہی کہہ دیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس لکھنے میں اس کہنے میں معاصرانہ چشمک اور حسد وغیرہم کا درآنا بھی ممکن ہے۔ وہ خود کو دیگر سمجھتے ہیں۔

تری چال ٹیڑھی، تیری بات روکھی
تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

اس شعر کے پہلے مصرع میں ''نتیجہ'' ہے اور دوسرے مصرع میں ''سبب''، سماجی ذہن کی اکائی کے حوالہ سے، فہم کے ضمن میں سبب نفسیات کے ساتھ ساتھ نسیان سے بھی مربوط ہے۔ یوں سبب کا تعلق گہرے ذہنی تصرف سے ہے۔ انفرادیت کے حوالے سے مجوزہ تصرف کی حیثیت بھی انفرادی ہوتی ہے۔ 'بجا' لیکن اس تصرف کے پاس یہ جواز نہیں کہ وہ تاریخ اور روایات سے، کسی وجہ کے بغیر روگردانی کرے۔ اس ضمن میں حقائق کا نام بھی لیا جاسکتا ہے یہ حقائق مقامی بھی ہوسکتے ہیں اور اور عالمی بھی۔ مثلاً پیدائش، موت، فراق، وصال، خوشی، غم، درد اور تقویم وغیرہم۔

بعضوں کے نزدیک یہ حقائق بھی شک وشبہہ کی زد سے باہر نہیں کہ ان کی کوکھ سے بھی سوالات جنم لے سکتے ہیں۔ سو میرؔ صاحب بھی پوچھتے ہیں۔

چرخ پر اپنا مدار دیکھیے کب تک رہے
ایسی طرح روزگار دیکھیے کب تک رہے

گیسوورخسارِ یار آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں
میرؔ یہ لیل ونہار دیکھیے کب تک رہے

تنہائی پسندی بھی میرؔ صاحب کی طبیعت کا ایک حصّہ ہے۔ تنہائی پسندی کا عنصر فرد کے سماجی تعلقات اور جذباتی معاملات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ اثرات مثبت نہیں، منفی ہوتے ہیں جو ذہن کے علاوہ جسم میں بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ یوں فرد اپنے ماحول، اور دنیا کے ساتھ ساتھ احباب واعزاء سے بھی کٹ جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ عمل فرد کی اپنی ذات پر دہرایا جا سکتا ہے، کبھی جزوی طور پر اور کبھی مکمل طور پر۔

یک دست جوں صدائے جرس بیکسی کے ساتھ
میں ہر طرف گیا ہوں جدا کاروان سے

میرؔ صاحب کی دنیا ''دنیا سے جدا ہے'' مثلاً تیرا کوئی ایسا رہ گزار نہ ہوگا جہاں ہر قدم پر سر نہ ہو، دل سے رخِ تکو کے جھانکنے تاکنے کا شوق کبھی نہیں جاتا، روہی وجود ہے جس پر اعتبار ہے ورنہ ہر شئے توہم کا کارخانہ ہے، ہندوستان میں گندم گوں خوب رووں کا کال ہے''۔

یہ باتیں ہر جا کو جہانِ دیگر کہنے والا ہی کہہ سکتا ہے۔

برقع اٹھا تھا رُخ سے مرے بدگمان کا
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے جہان کا

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز وشب تماشا
دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

اگرچہ جہاں میں نے سب چھان مارا
ولے اس کی نایابی نے جان مارا

مندرجہ بالا تینوں اشعار خود کلامی کے نمونے ہیں ۔ ان نمونوں میں نظارت اور بصارت کے ساتھ ساتھ تجزیہ کے باعث ابھرنے والا اعترافی احساس بھی ہے۔ اپنی ذات سے اعتراف کا احساس۔ لہٰذا زیرِ بحث شعر میں لفظ ''تُم'' زمانہ کے لئے نہیں خود شاعر کے لئے ہے۔ تاکہ وہ جگہوں کی درست حیثیت جاننے کے لئے ان سے سرسری طور پر نہیں غور کے ساتھ گزرے۔ یوں منظر اور پس منظر کی دید اور دید کی فہم واضح ہوگی۔ بے شک عرفانِ ذات کے لئے یہ عمل ناگزیر ہے۔

خود کلامی کے رسیا، جلوت میں بھی خلوت کے خواہاں میرؔ صاحب کی خدمت میں اس مضمون نگار کی ایک اعترافی رباعی حاضر ہے۔

تنہائی کو آزار نہ سمجھا تم نے
وجدان کو بخشا ہے سراپا تم نے
چہ خوب کہ ہر گام پہ اس دنیا کو
دنیا کی نظر سے نہیں دیکھا تم نے

میر تقی میرؔ۔ دورِ انحطاط میں انسان کی عظمت کا نغمہ گر

اردو غزل ولی دکنی سے اب تک ۳ سو سال سے زیادہ مدت کا سفر طے کر چکی ہے مگر ابھی تک عظمت و افتخار کا تاج اٹھارہویں صدی کے ممتاز شاعر میر تقی میرؔ کے سر پر ہے۔ ان کے اس امتیاز و سربلندی کا راز ہم آپ سب جانتے ہیں کہ ان کے عہد کے غیر معمولی سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اختلال و انتشار کے نہایت صبر آزما اور حوصلہ شکن عہد میں اس عظیم انسان کی اس نغمہ گری میں پوشیدہ ہے۔ جسے آج بھی ہم اپنے لئے انسان کی عظمت اور ناسازگار حالات میں اپنی خودی اور اپنی روح کی رفعتوں پر فخر و ناز کے ساتھ زندگی گزارنے کا قابلِ رشک عنوان سمجھتے ہیں۔ میرؔ نے اس وقت کے آگرہ میں آنکھ کھولی اور بچپن و جوانی کے ایام اس دہلی میں بسر کئے جو اپنے تمام تر تہذیبی امتیازات کے باوجود غیر معمولی سیاسی انتشار کے زد میں تھی۔ عالمگیر کی وفات کے بعد اس کی عظیم سلطنت کو اس کے نااہل وارثین سنبھال نہ سکے۔ چاروں طرف سے فتنوں کی یلغار اس شہر میں ہوئی جو اپنی ہزار خراب حالی کے باوجود اب بھی عالم میں انتخاب تھا اور جو شکستہ حالت میں بھی میرؔ کی نگاہ میں لکھنؤ کی مصنوعی چمک دمک کے بالمقابل وہ زیادہ اور کہیں زیادہ دلکشی اپنے اندر رکھتا تھا ؎

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

میرؔ ایک نہایت صوفیانہ و درویشانہ مزاج رکھنے والے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ میر متقی کی دوسری بیوی کی اولاد تھے باپ کو بے حد عزیز تھے اور اس چہیتی اولاد کو بھی باپ سے بے حد محبّت تھی اور ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ سات سال کی عمر تک والد کے صوفیانہ مزاج کے سانچے میں وہ ڈھلتے رہے۔ والد نے تصوف کی جادۂ سلوک پر ان کو چلانے کی کوشش کی پھر میر امان اللہ نے جو میرؔ کے والد کے مرید تھے انہیں قرآن اور صوفیانہ حقائق کی تعلیم دی۔ غرض ان کا

ڈاکٹر سید عبدالباری، سابق صدر شعبۂ اردو، اودھ یونیورسٹی، فیض آباد

بچپن بہت آرام سے گزرا اور بقول ڈاکٹر ابن فرید ان کی شخصیت کی تعمیر کے لئے اسی عہد میں بنیاد رکھ دی گئی تھی جس پر آئندہ ان کے مزاج و کردار کا ڈھانچہ کھڑا ہوا۔ میر امان اللہ کی تربیت نے انھیں استغنا، بے ثباتیِ حیات، درد و گداز اور سوزِ غم سے آشنا بنایا اور یہی زادِ سفر ان کی تخلیقی سفر میں ہمیشہ کام آتا رہا۔ اس نے بقول ابن فرید ان کی افتادِ طبیعت میں خلوت گزینی، بے نیازی اور ایک حد تک بے دماغی و انانیت کے عناصر داخل کئے اور اس عہد میں ان کی شخصیت کا خمیر تیار ہوا۔

(چہرہ پس چہرہ، ابن فرید۔ ص ۲۹)

میرؔ کی زندگی میں مشکلات کے باب کا آغاز والد اور میر امان اللہ کے انتقال کے بعد شروع ہوا جب سوتیلے بھائی نے ان کے لئے آگرہ میں قیام کو دشوار بنا دیا۔ دہلی کی طرف رُخ کیا اور کچھ دن امیر صمصام الدولہ کی نوازشوں سے بہرہ مند ہوئے مگر نادر شاہ کے حملوں نے دلّی کو خستہ حال بنا دیا۔ میرؔ کی پریشانیاں بڑھ گئیں پھر مرہٹوں کی لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہوا، پھر جاٹوں نے دلّی کو برباد کرنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا میرؔ ان سارے حالات میں اپنی متاع فکر و نظر سنبھالے دہلی میں دن گزارتے رہے۔ دوسری بار جب وہ دہلی آئے تو اپنے ماموں سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے زیرِ سایہ رہے لیکن وہاں بھی نبھ نہیں سکی۔ خان آرزوؔ بھی ان کے سخت مخالف ہو گئے اس زمانہ میں میرؔ پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی مگر ان کے کچھ احباب ان کی مدد کرتے رہے اور میرؔ سے دردمندی کا اظہار کرتے رہے۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنی مثنوی 'خواب و خیال' میں کیا ہے۔

بہر حال والد اور چچا کے انتقال اور دلّی میں طوائف الملوکی کے سبب میرؔ جیسے حساس انسان پر جو کچھ گزری اس نے انھیں الم پسند بنا دیا مگر انھوں نے اس الم پسندی کو بھی اپنی تہذیب میں داخل کر لیا۔ صوفیانہ تربیت انھیں بچپن میں مل چکی تھی اس لئے جو کچھ ان پر گزری اس کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کرتے رہے۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میرؔ کے والد نے انھیں بچپن میں ہی یہ درس دیا تھا۔ ''بیٹا دنیا ایک ہنگامہ سے زیادہ نہیں۔ اپنے دامن کو دنیاداری اور معصیت سے پاک رکھو۔'' باپ نے عشق حقیقی کی تلقین کی تھی۔ ''عشق ہی بناتا ہے، عشق ہی جلا کر کندن کرتا ہے۔ جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔'' میرؔ نے والد کی تلقین کو گرہ میں باندھ لیا اور کبھی دنیا کی طرف لالچ بھری نگاہ سے نہیں دیکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کائنات کی نیرنگیوں کے ذریعہ وہ محبوب حقیقی کو پہچاننے اور اس کی قدرت پر آفرین کہنے کا جوہر رکھتے تھے ۔

اس باغ کے ہر گل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
حیرت ہے بڑی ان کے صاحب نظروں کو

شاید اس افراتفری اور ان جانگداز حالات میں جن سے میرؔ اور ان کے ہم وطن گزر رہے تھے یہی عشق حقیقی کا سرمایہ میرؔ کے کام آیا۔ اس نے انھیں خودداری، خود اعتمادی اور سکونِ قلب عطا کیا ورنہ تصور کیجئے کہ جس شخص نے عمر کا بڑا حصہ دلی کی گلیوں میں بسر کیا ہو اور ان کوچوں کو اوراق مصور کی طرح دلکش سمجھتا ہو اس پر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ جانے اور وہاں کے پُر تصنع ماحول میں جہاں حقیقت نہیں مجاز میں مجاز کی جلوہ گری تھی کیا کچھ نہ گزری ہوگی ۔

کیا نام و نسب پوچھے ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

میرؔ کے کلام میں غم کی جلوہ گری اس لئے ہے کہ وہ غم کی سیلِ رواں میں خود گرفتار تھے لیکن کمال یہ ہے کہ یہ غم ان کو سرنگوں نہیں کرتا۔ وہ غم کا بار بار ذکر کرتے ہیں مگر اس سے شکست نہیں کھاتے۔ وہ غم کو تقدیرِ بشر کا ایک ناگزیر جزو سمجھتے ہیں۔ وہ شکستوں پر شکستیں کھاتے ہیں مگر ہار

ماننے کو تیار نہیں وہ جانتے تھے کہ اس کی بدولت انسان کو فرشتوں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے ۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

وہ غم میں تڑپتے اور فریاد کرتے ہیں مگر غم نہ تو ان کا ساتھ چھوڑتا ہے اور نہ وہ خود اس کا ساتھ چھوڑتے ہیں اس عالمِ ناپائیدار کی حقیقت سے وہ آگاہ ہیں۔ اس کی بے ثباتی پر ایسے چبھتے ہوئے اشعار انھوں نے کہے ہیں جس کا کوئی بدل پوری اردو شاعری میں موجود نہیں ۔

کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

میرؔ غم اور زندگی کو لازم ملزوم تصور کرتے ہیں اور ڈاکٹر ابن فرید کے الفاظ میں وہ اپنی محرومیوں کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے قائل تھے۔ غم کی یہ رازداری میرؔ کی ایک خاص ادا ہے جو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو ۔

پاس ناموسِ عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

چپکے ہیں ہم تو حیرتِ حالاتِ عشق سے
کریئے بیاں جو واقفِ اسرار ہو کوئی

غم کی یہ پردہ داری توکل و استغنا کی اس تعلیم کی بدولت تھی جو عمر کے ابتدائی دور میں انھیں اپنے والد سے ملی تھی۔ اسی وجہ سے وہ اپنے سوز دروں کو زبان پر لانا اپنی غیرت کے خلاف تصور کرتے تھے ۔

رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

بخشش نے مجھ کو ابر کرم کی کیا خجل
اے چشم جوش اشک ندامت کو کیا ہوا

میرؔ پر گردشِ روزگار اور زمانے کے نہایت ناسازگار احوال کے سبب جو کچھ گزر چکی تھی

اس کے سبب وہ دنیا کو بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ۔ بقول ڈاکٹر ابن فرید دنیا کی تمام دلچسپیاں بڑی سفلی اور کوتاہ قد نظر آتی ہیں ۔ اس حقیر دنیا میں وہ اپنا قد بلند محسوس کرتے ہیں اور اس پر اپنی بالاتری کا اعلان کرتے ہیں جسے میرؔ کی بد دماغی قرار دیا جاتا ہے ۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

آگے کسی کے کیا کریں دستِ طمع دراز وہ ہاتھ سو گیا ہے سرھانے دھرے دھرے

میرؔ کی دردمندی انھیں اردو کا سب سے بڑا انسان دوست بنا دیتی ہے ۔ میرؔ کی بے مثل خودداری ان کے قد کو دراز کرتی جاتی ہے ۔ وہ اپنے غم کی رفعت و عظمت کو محسوس کرتے ہیں اور اس کی حفاظت کرنا اپنا فرض تصور کرتے ہیں ۔ یہ غم ایسا ہے کہ جو بے شمار سینوں میں خلش اور سوز و گداز پیدا کر دیتا ہے ۔

گداز عاشقی کا میرؔ کے شب ذکر آیا تھا جو دیکھا شمع محفل کو تو پانی ہو گئی گھل کر

دل کس قدر شکستہ ہوا تھا کہ رات میر جو بات لب تک آئی وہ فریاد بن گئی

دیکھئے اردو کا یہ ہمالیہ سے اونچا قد رکھنے والا شاعر اس دنیائے دنی پر کس طرح نظر ڈالتا ہے اور اس تماشہ گاہِ عالم سے اپنا دامن آلودہ نہیں ہونے دیتا ۔

فرصت کم ہے یاں رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو ایسا کچھ کر کے چلو یاں کے بہت یاد رہو

میرؔ اس دنیا پر حقارت بھری نگاہ ڈالنے کے ساتھ اس کے دلکش جلووں سے لطف اندوز ہونے کا بھی سلیقہ عطا کرتے ہیں ۔ وہ خالقِ کائنات کی تخلیقی نیرنگیوں کو جی بھر کر دیکھتے ہیں اور اس سے انھیں ایک نیا عرفان، ایک نیا ولولہ اور ہزار ناسازگاریوں کے باوجود زندہ رہنے کا حوصلہ ملتا ہے ۔

سرسری تم جہان سے گزرے ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

چلتے ہو تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

کیا دلفریب جائے ہے آفاق ہم نشیں　　دو دن کو یاں جو آئے وہ برسوں نہ جا سکے

دلکشی اس بزم کی ظاہر ہے تم دیکھو تو ہو
لوگ جی دیتے چلے جاتے ہیں کس حسرت سے یاں

میرؔ اس دنیائے فانی کی حقیقت سے آگاہ ہیں اور اسے آرام و آسائش اور سکون و راحت کی جگہ نہیں تصور کرتے ۔ بقول ڈاکٹر ابن فرید وہ زندگی کی پہنائیوں میں جس قدر بالغ النظری سے غوطہ لگاتے ہیں وہ ان کی بصیرت اور فکری صحت مندی کی غمازی کرتا ہے۔ فکر و نظر کے باریک سے باریک نکات ان کی شاعرانہ گرفت میں اس طرح آتے ہیں کہ ایک واضح اور عام فہم حقیقت بن جاتے ہیں۔

(بحوالہ چہرہ پس چہرہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علیگڈھ　ص ۲۶)

ہوتا ہے اس جہاں میں ہر روز و شب تماشا　　دیکھا جو خواب تو ہے دنیا عجب تماشا

عجب ہم بے بصیرت ہیں کہاں کھولا ہے بار آ کر
یہاں سے لوگ سب رختِ سفر کرتے ہیں بار اپنا

میرؔ موت کو بھی کوئی ہمت شکن حادثہ نہیں تصور کرتے ۔ یہاں ان کی صوفیانہ تربیت کام آتی ہے اور موت کے بعد ایک روشن مستقبل کی انھیں خبر دیتی ہے ۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

مرگ کیا منزل مراد ہے میرؔ　　یہ بھی اک راہ کا توقف ہے

یہ سچ ہے زندگی کے بارے میں اس قدر رجائیت ہمیں میرؔ کے بعد اقبالؔ کے یہاں ملتی ہے۔ وہ غم سے کبھی شکست تسلیم نہیں کرتے ۔ وہ اندر سے بڑی مستحکم شخصیت کے مالک ہیں جو حوادث روزگار سے ٹوٹتی اور بکھرتی نہیں ہے وہ بلیغ کائناتی حقیقت کو ہمیشہ ذہن میں رکھتے ہیں

کہ اس زندگی میں خوشی اور غم تو اہم ہیں۔ بہتر ہے کہ جتنی خوشی ہم اس دکھ بھری دنیا میں سمیٹ سکتے ہیں اس میں کوتاہی نہ کریں اور اس کائنات کے حسن و دل فریبی پر نظر گاڑے رہیں ؎

ہر قطعہ چمن پر ٹک گاڑ کر نظر کر　　بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول اک بنا ہے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

بقول ظ۔ انصاری آدمی و صورتِ حال کا رشتہ میرؔ کے نزدیک بڑا پُر اسرار ہے۔ اس رشتے کی شناخت اور انسان کی محرومیوں، نا مرادیوں اور شکستوں کے پیچھے کارفرما اسباب کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش میرؔ کو ایک عظیم مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ خوددار و خود آگاہ ہونے کے باوجود خود پرست نہیں۔ میرؔ انسان کو حقیر ماننے اور اس کی تذلیل برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آدمی کے اعتبار و وقار کی جس جس طرح انھوں نے حمایت کی اردو کے کسی اور شاعر نے نہیں کی ہوگی۔ (قومی آواز، ۷/جون ۱۹۹۰ء)

میرؔ کی شخصیت کی تذکرہ نگار بڑی دلکش تصویر کھینچتے ہیں۔ صاحب نوادر اکملا کے مطابق، دوستوں سے سراپا ارتباط، حرص و ہوائے دنیا سے آزاد، کسی کو ناراض نہ کرنے والے اور کسی کے لئے کوئی کلمۂ بد نہ کہنے والے انسان تھے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرورؔ ان کے کلام میں ایک دردمند انسانیت کی فریاد سنائی پڑتی ہے۔ خدا کے حضور انسانی فریاد پر فی الفور کوئی شنوائی نہ دیکھ کر شکوۂ زیرِ لب کرتے ہیں ؎

خدا کو کام تو سوپے ہیں سب و لے اے میرؔ
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

بقول ڈاکٹر فاطمہ تنویر۔

''وہ اپنے دور کی ٹوٹتے بکھرتے انسان اور ڈگمگاتی اخلاقی اقدار پر گریہ کناں ہیں لیکن اس گریہ میں وقار و تہذیب کا دامن نہیں

چھوٹتا ہے۔ زندگی کے جبر و قہر کا بار بار ذکر کرنے کے باوجود انھوں
نے انسانی عظمت کا نغمہ چھیڑا ہے۔ وہ مغرب کے قنوطیوں کی طرح
انسان کو اندھی مشیت کا کھلونہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ وحدت
الوجود کے قائل ہیں اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں خدا کا جلوہ دیکھنے کی
تلقین کرتے ہیں۔''

(اردو شاعری میں انسان دوستی، ڈاکٹر فاطمہ تنویر۔ ایجوکیشنل پبلشر دہلی)

گوش کو ہوش کے ٹک کھول کے سن شور جہاں
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک

دل صاف ہو تو جلوہ گہہ یار کیوں نہ ہو　　آئینہ ہو تو قابلِ دیدار کیوں نہ ہو

میرؔ آدم کی خاکی عظمت اور شان پر جان دیتے ہیں ؎

مرتے ہیں ہم تو آدمِ خاکی کی شان پر　　اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ　　آئینہ تھا یہ ولے قابلِ دیدار نہ تھا

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے ملک　　آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں

کیسی شکلیں محبوبوں کی پردۂ غیب سے نکلی ہیں
منصف ہو تک اے نقاشاں ایسے چہرے بناتے تم

یہ راہ و روش سرو گلستاں کی نہ ہوگی　　اس قامت دلچسپ کا انداز دگر ہے

مگر میرؔ اپنے عہد میں انسان کے زوال اور ایسی بے مثل مخلوق کے انحطاط پر ماتم کناں بھی ہیں ؎

آدمی اب نہیں جہاں میں میرؔ　　اٹھ گئے اس بھی کارواں کے لوگ

اس بت کدہ میں معنی کا کس سے کریں سوال　　آدم نہیں ہیں صورتِ آدم بہت ہیں یاں

میر تقی میرؔ اردو شاعری میں دل کی عظمت کے سب سے بڑے ثنا خواں ہیں۔ بقول ڈاکٹر فاطمہ تنویر اس آئینہ کے ذریعہ وہ سارے عالم سے روشناس ہوتے اور اسے کعبہ سے زیادہ

محترم تصور کرتے ہیں ؎

دل نے ہم کو مثالِ آئینہ ایک عالم کا روشناس کیا

دل میں رہ دل میں کہ معمار قضا سے اب تک

ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

اسی دل کے ذریعہ وہ احترام نفس کی منزل تک پہنچتے ہیں اور دردمندی کو خلاصہ آدمیت قرار دیتے ہیں ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ ہے دل پر خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے دردمندی میں گئی اس کی جوانی ساری

غرض یہ اردو کا نرالا اور انوکھا شاعر ہے جو عین عالمِ اضطراب و انحطاط میں انسان کی عظمت کا نغمہ خواں ہے۔ جو درد سہتا ہے اور درد کا اظہار بھی کرتا ہے مگر درد سے شکست تسلیم نہیں کرتا۔ انسان دوستی کی عظیم قدروں اور صوفیا کی انسانی دردمندی کی قدروں سے جس کا سینہ لبریز ہے۔ جو عین طوفان و انقلاب کے عین سامنے کھڑا ہوا ہے اور اپنی کج کلاہی میں کسی طرح کی کمی نہیں آنے دیتا۔ جس کی شاعری کا محور دل اور انسان کی رفعت ہے۔ وہ ہر طرح کے اندوہناک احوال میں بھی اپنے ہم جنسوں کو یہ تلقین کرتا ہے ؎

مت اس چمن میں غنچہ روش بود و باش کر

مانند گلِ شگفتہ جبیں یاں معاش کر

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

میرؔ کی شاعری میں عظمت انسان کا تصور

میرؔ کو اردو شاعری کا خدائے سخن کہا جاتا ہے یہ ان کی قادر الکلامی اور ان کے شاعرانہ مقام و مرتبے کے اعتراف کے طور پر ہے خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے ساری کائنات اور اس کے اندر ہزاروں جہانوں کی تخلیق کی۔ میرؔ کی کائنات ان کی شاعری ہے انھوں نے اپنی فنکارانہ خلاقی سے اس کائنات میں فکر و معنی کے ہزاروں جہانوں کی تخلیق کی ہے۔ لہٰذا وہ اپنے شاعرانہ مقام و مرتبے کے اعتبار سے بھی خدائے سخن ہیں اور ایجادِ مضمون، تخلیق معانی اور قوت اظہار کے اعتبار سے بھی خدائے سخن ہیں۔ ان کی شاعری بیان کی سادگی، جذبات کی ترسیل اور نشتریت کی بدولت شہرت و مقبولیت کی حامل ہے۔ میرؔ نے اپنی شاعری میں زیادہ تر غم انگیز خیالات اور المیہ کیفیات کا ابلاغ کیا ہے۔ لیکن میرؔ کا کمالِ فن یہ ہے کہ عشق کے سوز و گداز اور زندگی کے درد و داغ کی ترجمانی کے باوجود ان کی شاعری قنوطیت کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ قاری کے جذبات کا تزکیہ کرتی ہے۔ درد و غم سے ہر شاعر کو سابقہ پڑتا ہے لیکن میرؔ نے نہایت سلیقے اور ہنرمندی سے اپنے زخمِ تمنا کو زمانے کا غم اور زمانے کے غم کو اپنا زخمِ دل بنالیا ہے۔ یہی ان کے عظیم شاعر ہونے کا ثبوت ہے ان کے اشعار میں غمِ یار، غمِ روزگار کا آئینہ بن جاتا ہے اور غمِ ذات غمِ کائنات میں ڈھل جاتا ہے۔

میرؔ کی شاعری میں صرف رنج و الم اور درد و غم کی ترجمانی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ تقدیس غم کے ساتھ ساتھ انھوں نے عظمتِ آدم کی بھی بات کی ہے۔ زمانے کے آشوب اور خارجی حالات کی ناہمواری اور انتشار کے باوجود میرؔ کے یہاں زندگی کی مثبت قدروں کا احترام اور انسان کی عظمت کا یقین ملتا ہے۔ وہ اس کائنات میں، کائنات کی ساری مخلوقات میں انسان کو سب سے اعلیٰ و اشرف سمجھتے ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ انسان بننا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ زمانے نے ہزاروں گردشیں کھائیں تب کہیں جا کر انسانِ کتمِ عدم سے منظر شہود پر آیا ہے ؎

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریسؔ، ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مت سہل ہمیں جانوں پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

خالقِ کائنات نے انسان کی تخلیق یونہی نہیں کی اس نے انسان کی آفرینش سے قبل اس کارخانۂ فطرت کو آراستہ کیا ۔اس کے بعد آدم کی ہستی کو پردۂ غیب سے منزلِ شہود کی زینت بنایا۔ قرآن مجید سے یہ تو ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کی تخلیق کی لیکن اس نے انسان کی مدت تخلیق کا تعین نہیں کیا۔ پتہ نہیں انسان کو وجود میں لانے کے لئے کتنا زمانہ لگا ہوگا؟ تخلیق آدم سے قبل حق تعالیٰ اور ملائکہ کے بیچ مکالمہ بھی ہوا، فرشتوں نے شبہ ظاہر کیا کہ انسان زمین پر فساد پھیلائے اور خون بہائے گا لیکن خدائے لم یزل نے اپنی حکمت سے فرشتوں کے اعتراض کو اعتبار کا درجہ نہیں دیا اور انھیں انسان کا پیکرِ خاکی بنانے کا حکم دیا۔ جب انسان کا ہیولیٰ تیار ہوا تو خالق کائنات نے اس میں اپنی روح پھونکی اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے سجدہ کریں۔اس طرح انسان مسجود ملائکہ قرار پایا جو اس کی عظمت اور فضیلت کا پہلا سنگ میل ہے۔کائنات کی تخلیق اور آدم کی تعمیر کے درمیان جو وقفہ ہے ہم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ پتہ نہیں اس مدت میں آسمان نے کتنی گردشیں کی ہونگی، زمین نے کتنا انتظار کھینچا ہوگا۔تب کہیں جا کر آدم کا پیکرِ گل تیار ہوا اور اسے زندگی ملی۔اس لئے میرؔ کہتے ہیں انسان کو حقیر نہ جانو فلک نے لاکھوں چکر کاٹے ہوں گے تب کہیں جا کر خاک کے پردے سے انسان کی نمود ہوئی ہے۔

میرؔ کے محولہ شعر میں یہ مفہوم بھی پنہاں ہے کہ اعلیٰ خوبیوں اور مثالی اوصاف رکھنے والے انسان جن کی سیرت و کردار سے عظمت انسانیت کا بھرم قائم ہے بار بار پیدا نہیں ہوتے بلکہ صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتے ہیں۔ یوں کہنے کو بہ ظاہر ہر آدمی انسان ہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ حقیقی انسان کچھ اور ہوتا ہے۔ جو آدمی انسانیت کے معیارات، اعلیٰ قدروں اور بلند اوصاف کا حامل ہوتا ہے وہی حقیقت میں انسان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اور ایسے ہی انسان کا رتبہ فرشتوں سے بلند تر ہوتا ہے۔میرؔ کا ہی شعر ہے ؎

آدمی سے فلک کو کیا نسبت　　شان ارفع ہے میرؔ انساں کی

حالیؔ بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ کہتے ہیں ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا　　مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

واقعہ یہ ہے کہ بہ حیثیتِ نوع آدمی تو سبھی ہیں لیکن سب انسان نہیں۔ آدمی سے انسان بننے کا سفر نہایت کٹھن ہے یہ سفر دراصل خیر و شر، نیکی و بدی، حق و باطل اور روحانیت و مادیت کے درمیان کش مکش و کشاکش کا سفر ہے۔ اس راستے میں جو آدمی شر سے دامن بچا کر خیر کو اپناتا ہے بدی کو چھوڑ کر نیکی کو گلے لگاتا ہے، باطل کو دھتکار کر حق کو اختیار کرتا ہے اور مادیت کو ترک کر کے روحانیت سے وابستہ ہوتا ہے وہی دراصل صحیح معنی میں انسان ہے اور اسی کے سر پر عظمت اور فضیلت کا تاج ہے لیکن اس مرتبۂ بلند کا حصول آسان نہیں ہے۔ نفس کی ترغیبات کو رد کرنا اور حق و ضمیر کی آواز کو سننا بڑے مجاہدے اور ریاضت کا کام ہے۔ صوفیائے کرام نے جسے فنائے انا یا نفئ ذات کہا ہے وہ دراصل آدمی سے انسان بننے کا سفر ہی ہے جو بہت دشوار ہے اسی لئے غالبؔ نے کہا تھا ؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

انسانیت کی برتری اجاگر کرنے کے لئے ایک شعر میں میرؔ کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا باپ آذر کافر اور بت تراش تھا لیکن اس کے حوصلے کی بلندی دیکھئے کہ وہ اپنے گمان میں پتھر سے خداؤں کی تخلیق کرتا تھا ظاہر ہے کہ وہ زعم باطل میں مبتلا تھا اور غلط راستے پر چل رہا تھا لیکن جب ہم اپنے آپ کو موحّد اور صاحبِ ایمان کہتے ہیں تو اپنے آپ کو کم سے کم انسان تو بنائیں ؎

خدا ساز تھا آذرِ بت تراش

ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

انسان کی عظمت و کرامت کا راز یہ ہے کہ وہ اس زمین پر خدا کا نائب یا خلیفہ ہے۔ یہ ایسی عظیم اور گراں بار ذمہ داری ہے کہ جسے قبول کرنے کے لئے ساری کائنات میں کوئی تیار نہ تھا۔

سب ڈر گئے کسی میں اس منصب کو قبول کرنے کی ہمت نہ تھی تب انسان نے آگے بڑھ کر خدا کی امانت کا بوجھ اپنے کمزور کندھوں پر لے لیا۔ یعنی بقول میرؔ ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی　　اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

خدا کی نیابت کے اس بار کو اٹھانے اور خدا کی امانت کو سنبھالنے کی نازک ذمہ داری قبول کرنے کے سبب انسان کو تمام مخلوقات پر فضیلت اور بزرگی حاصل ہوئی لیکن یہ فضیلت اور یہ شرف اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرتا ہے اور جب اس کے اخلاق و کردار و سیرت و اطوار اس کے مقام و مرتبے کی شایانِ شان نہیں ہوتے تو پھر وہ اپنے مقام و منصب سے معزول ہو جاتا ہے، اس کی عظمت کا تاج اس سے چھن جاتا ہے اور وہ قعر مذلت میں جا گرتا ہے چنانچہ عہدِ حاضر میں انسانیت کی تباہی و زوال اور اس کی رسوائی و ارزانی کا اصل سبب انسانیت کے ابدی و آفاقی اقدار سے بغاوت و انحراف ہے۔ آدم کی ارزانی کا شکوہ اقبالؔ نے بھی کیا ہے ؎

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

لیکن ان سے پہلے غالبؔ نے انسانیت کے ضعف و زوال اور تنزل و انحطاط پر یوں صدائے احتجاج بلند کی تھی ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

آج کرۂ ارض پر نظر دوڑائیے ہر جگہ تخریب کے نقشے ملیں گے۔ انسانیت تڑپتی سسکتی ملے گی۔ انسان کی حیثیت مور و ملخ اور حشرات سے بھی کمتر ہو گئی ہے۔ انسانی زندگی کی اس بے حرمتی، جان مال عزت و آبرو کی بے وقعتی اور انسانی قدروں کی پامالی یا بہ الفاظ دیگر انسانیت کی اس تذلیل کا سبب یہ ہے کہ انسان نے خود اس کائنات میں اپنے مقام و منصب کو فراموش کر دیا ہے۔ اس المیے کو ہر بڑے شاعر اور ادیب نے محسوس کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میرؔ نے بھی محسوس کیا ، غالبؔ نے بھی محسوس کیا اور اقبالؔ نے محسوس کیا اور ہر ایک نے اپنے اپنے مزاج و افتاد اور منہاج و اسلوب کے مطابق اس پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔ غالبؔ نے سوال اٹھائے ہیں کہ حق تعالیٰ آج بنی نوع انسان سے کیوں بے نیاز ہو گیا ہے؟ حالانکہ کل یہ حال تھا کہ اگر فرشتہ بھی انسان کی شان میں گستاخی کرتا تو۔۔۔۔۔اللہ تعالیٰ کو سخت ناگوار ہوتا۔ چنانچہ آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش ہی میں تو شیطان پر پھٹکار پڑی اور اسے راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔ آج اسی انسان کی تباہی و ذلّت خالق سے کیوں برداشت ہو رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کیوں کا جواب ہر کوئی جانتا ہے۔ غالبؔ سوال کر کے انسان کو اس کے مقام و مرتبہ کا احساس دلا رہے ہیں جب کہ میرؔ نے تعلّی کا انداز اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ انسان کا مرتبہ ایسا عظیم ہے کہ اس کے انتظار میں آسمان کو بھی برسوں گردشیں لگانی پڑیں۔ ایک اور شعر میں میرؔ نے عظمتِ انسان کے اس تصور کی ترسیل اس طرح کی ہے۔

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتے تھے ہم تب ہم
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

آدم خاک نہاد ہے۔ یعنی اس کی تخلیق مٹی سے ہوئی وہ اس تناظر میں آسمان کے خاک چھاننے کا بصری پیکر نہایت پُر لطف اور معنی خیز ہے۔ خاک چھاننے سے مراد مسلسل محنت کے ساتھ تلاش کرنا ہے۔ اس شعر کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ آسمان کی چھلنی ۔ ۔ لاکھوں برس تک خاک چھانی یہاں یہ بات خاطر نشیں رہے کہ رات کے وقت تاروں بھرا آسمان ایک ایسی بڑی چھلنی معلوم ہوتا ہے جس کے ان گنت سوراخوں سے روشنی جھانک رہی ہے۔ آسمان نے خاک کو لاکھوں برس تک چھانا یہاں تک کہ وہ مٹھی بھر رہ گئی تب اس مٹھی بھر خاک سے انسان کی تخلیق ہوئی۔ خاک چھاننے کے محاورے کے توسط سے میرؔ نے ایک اور شعر میں عظمت انسانیت کو موضوع بنایا ہے۔ یہاں انھوں نے محبوب یا وقت یا اہل دنیا کے ظلم و ستم اور ان کے غیر منصفانہ رویے کی شکایت کرتے ہوئے انسان کی شرافت اور عظمت پر زور دیا ہے۔ کہتے ہیں ۔

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

یعنی مدتوں کی تلاش و جستجو کے بعد آسمان نے جن اہل نظر اور اربابِ کمال کو پیدا کیا تھا انھیں ظالم و جابر، حاوی اور مسلط قوت نے ایک ہی جھٹکے میں ختم کر دیا۔ ختم ہونے والوں کے عزو وقار کا خیال کیے بغیر۔ ہم نے گفتگو کا آغاز میرؔ کے جس شعر سے کیا تھا یعنی۔

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اس میں ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ میرؔ وقت کے جابر اور مستبد قوتوں کو متنبہ کر رہے ہیں کہ ہمیں کمزور اور حقیر جان کر مت مٹاؤ۔ ہم بھی انسان ہیں، ہمارے وجود کو ذلیل اور بے وقعت نہ کرو۔

میرؔ نے اپنی شاعری میں مختلف مقامات پر اسلوب بدل بدل کر عظمتِ آدم کے تصور کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و ماہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

اس شعر میں تعلی ذات کا پہلو تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ نوع بشر کی عظمت و رفعت کا ادراک بھی ہے شاید میرؔ کے اسی خیال سے استفادہ کرتے ہوئے اقبالؔ نے کہا تھا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

میرؔ کا ''صاحبِ نظر'' اور اقبالؔ کا ''دیدہ ور'' دونوں ایک ہیں۔ صاحبِ نظری یا دیدہ وری عرفان نفس یا شعور ذات کا اشارہ ہے۔ جب آدمی کو اپنی حقیقت کا عرفان ہوتا ہے تو وہ اپنے مقام اور منصب کے شایانِ شان کردار بھی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی حقیقت سے بے خبر آدمی اعلیٰ اوصاف پیدا کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا ہے۔ جب آدمی کو اپنی اصل کا شعور

ہوتا ہے تو وہ غالبؔ کی طرح بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

جب انسان کو اپنے مقام و مرتبے کی رفعت کا عرفان ہوتا ہے تو پھر کسی ایرے غیرے کے آگے اس کا سر نہیں جھکتا۔

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

ایک اور شعر میں کہتے ہیں۔

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

آدم زاد خاک کا پتلا ہے لیکن اس کا مرتبہ آسمان سے بلند ہے۔ میرؔ کہتے ہیں کہ انسان خاکی ہے لیکن اس خاک بسر انسان کے حوصلوں اور مقاصد کی بلندی کے آگے آسمان بھی پست ہے۔

مراہوں میں تو آدمِ خاکی کی شان پر
اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر

بات دراصل یہ ہے کہ انسان ہی اس کائنات کا مرکزی وجود ہے اسی کی خاطر حق تعالیٰ نے زمین و آسمانوں کی تخلیق کی۔ قدرت کا سارا نظام اسی کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ پوری کائنات اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار ند
تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نہ خودی

کائنات کی ساری رونقیں اور سارے ہنگامے آدمی سے اور آدمی کے لئے ہیں۔ زندگی کی تگاپو، خیر و شر کا تصادم، حق و باطل کی معرکہ آرائیاں، جرأت و شجاعت، صبر و استقامت اور کوشش و کاہش کی گرم بازاری اسی کے دم سے ہے۔ کائنات سے اگر انسان کے وجود کو ہٹا دیا جائے تو

کائنات کا حسن ختم ہو جائے گا۔ کائنات بے رونق ہو جائے گی۔ چنانچہ آفرینشِ آدم سے قبل کائنات حرکت وحرارت اور رنگ ورونق سے محروم تھی اس عالم رنگ وبو میں انسان کی مرکزیت پر اصرار کرتے ہوئے میرؔ کہتے ہیں ۔

آدمِ خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

اقبالؔ بھی میرؔ کے ہم نوا نظر آتے ہیں جب وہ کہتے ہیں ۔

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد
مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

حاصل کلام یہ کہ میرؔ کی نظر میں انسان کا مقام نہایت اعلیٰ وارفع ہے۔ حقیقی انسان حاصل کائنات ہوتا ہے۔ انھوں نے شاعری میں اس عقیدے کا متعدد مقامات پر اظہار کیا ہے۔ اس طرح میرؔ کی شاعری انسان کو اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنے اور اس کے شایان اخلاق واوصاف پیدا کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

میر تقی میرؔ کی فارسی شاعری

دگر گون گشت رنگ بزم از حرف غم افزایت
غلط کردم ترا ای میرؔ تکلیف سخن کردم

میر تقی میرؔ نے اردو غزل کو بلا شبہہ رفعت اور حیرت خیز گہرائیوں اور گیرائیوں کا مالک بنا دیا لیکن انھوں نے فارسی شاعری خصوصاً فارسی غزل کے چمن کی آبیاری بھی نہایت سلیقے سے کی اور اس میں نادر و لطیف مضامین کے گلہائے رنگا رنگ کھلائے۔ جن میں دلاویز رنگ بھی ہے اور جاں نواز خوشبو بھی، مسرت آفرین تازگی بھی ہے اور عشرت افزا ناز کی بھی۔ ان کی فارسی شاعری کی نغمہ سنجیوں اور زمزمہ سرائیوں کی دلکشی کے معترف بڑے بڑے اساتذہ شعر و ادب ہیں۔ خان آرزو نے مجمع النفائس میں لکھا ہے کہ ''ہر چند میرؔ دیوان مختصر دارد اما غزلہای دردمندانہ و عاشقانہ می گوید بگفتن اشعار فارسی بطرز خاص گرویدہ و قبول خاطر ارباب سخن و دانایان این فن گشت طبعش بہ مضامین تازہ در غیر مبتذل معنی پرداز است و اشعار او بہ لطافت ادا و انداز (ممتاز) از بسکہ ذہن مناسب و طبع ثاقب یافتہ در ابتدای مشق شعر رتبہ سخن را بہ پایہ انتہا رسانید۔'' یہ امر مصدقہ ہے کہ میرؔ نے پہلے اشعار ریختہ (اردو) میں شعر گوئی کی مشق کی اور بعد میں فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور فارسی شعر کہنے کی ابتداء ایک خاص طرز کے ساتھ کی اور وہ طرز ارباب سخن اور ماہرین فن میں مقبول ہوا۔ صاحب طبقات الشعراء نے خوب لکھا ہے کہ ''ہر چند سادہ گو است اما در سادہ گوی پرکار یہا دارد۔''

فارسی میں میرؔ کا سرمایہ ایک دیوان ہے جو تقریباً پونے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے لیکن زمانے نے اسے تقریباً طاق نسیان بنا دیا ہے۔ خود میرؔ کو بھی اپنی فارسی شاعری پر چنداں ناز نہ تھا وہ اپنی اردو شاعری کو ہی اپنے خرمن کمال کا گل سرسید سمجھتے رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا فارسی کلام بھی انھیں خصوصیات کا حامل ہے جو اردو کلام میں پائی جاتی ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر جعفری، صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

میرؔ کا قصر بلند جذبہ عشق کے مستحکم ستونوں پر ہے وہ اپنے جذبات، کیفیات، تجربات اور واردات کا بیان ایک حسین جمالیاتی کیفیت سے کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں داستان عشق بے شمار زاویوں سے نئے نئے لہجوں اور نو بہ نو اسالیب میں سامنے آتی ہے۔ سوز و گداز سے لبریز خلوص اور اپنائیت کے احساس سے پُر اشعار قاری کے احساس جمال کو نہ صرف تسکین بلکہ اس کے زخموں پر مرہم بھی لگاتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

میرم ز رشک آن کہ بہ وقت وداع جان
چشمی گشود و دید بہ سر یار خویش را
جور و جفا است کار تو و من ز سادگی
موقوف رحم داشتۂ ام کار خویش را

میرؔ سرتا پا فنافی العشق ہیں ان کے نزدیک کائنات دراصل عشق کا کارخانہ ہے اور زندگی محبت کے بغیر بے معنی۔ میرؔ اوائل جوانی میں ہی ایک قتالہ عالم کی محبت میں اس قدر مبتلا ہوئے کہ انھیں جنون سا ہو گیا اور چاند میں بھی انھیں محبوب کا جمال دلفریب نظر آنے لگا اور وفور عشق میں وہ جدھر دیکھتے اپنے معشوق کا ہی جلوہ دکھائی دیتا۔ کہتے ہیں ؎

بہ عہد جنون شورشی داشتم　　تو نشنیدہ ای ہای و ہوی مرا

میرؔ نے اپنے اشعار میں عشق کی عظمت اور اسکی نیرینگیاں بیان کی ہیں جو جذبۂ محبت سے لبریز ہیں ان سے عشق کی سرشاریاں اور محبت کی گلکاریاں جھلکتی ہیں ان کے اشعار میں حسن کا احساس اور محبت کے وفور کا امتزاج قابل دید ہے۔ کہتے ہیں ؎

میرؔ اگر این است جوش گریہ در ہجران یار
ابر خواہد برد آب از دیدۂ گریان ما

میرؔ کی شاعری میں عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں کی جلوہ طرازیاں نظر آتی ہیں۔ عشق مجازی کے ضمن میں انھوں نے اکثر محبوب کا براہ راست سراپا نظم کرنے کے بجائے عاشق کے

احساسات اور اس کی قلبی کیفیات کو بیان کرنا زیادہ مناسب سمجھا جو معشوق کو دیکھکر اس کے دل پر گزرتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

دیدہ تر کی تسلی بخش عاشق می شود
منبع طوفان شود یارب سرمژگان ما

ان کی غزلوں کا محور و مرکز عشق کا جذبہ ہے جن میں تصور عشق کی ہی ترجمانی نظر آتی ہے ان کے یہاں عشق ایک بے حد وسیع اور عریض معنی رکھتا ہے یہ جذبہ عاشق کے دل میں گداختگی اور دل سوزی میں مسلسل اضافہ کرتا رہتا ہے ان کے عشقیہ اشعار احترام انسانیت کے مبلغ ہیں ان کے نزدیک محبت ہی انسانی زندگی کو بامعنی بناتی ہے وہ انسانی اقدار کی برگزیدگی کے لئے عشق کو بطور اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور اسے اشرف المخلوقات کی معراج تصور کرتے ہیں۔ صوفیوں کے یہاں تو عشق اور بھی وسیع تر معنوں میں استعمال ہوا ہے جہاں عشق کے بغیر زندگی کو وبال سمجھا جاتا ہے اور مادی زندگی کو معشوق حقیقی کے ہجر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عشق حقیقی کے تعلق سے میرؔ کے یہ چند ابیات قابلِ غور ہیں ؎

بیا ای میرؔ در راہ محبت خویش را گم کن — اگر خواہی کہ دریابی نشان بی نشاناں را
رفتۂ شوق شود دیر و حرم را بگزار — طوف کن میرؔ بہ ہر در بہ سجود آمدہ را

ای کہ داری سر آن کوچہ اگر خواہی رفت — یادگاری است زما ہم دل صد چاک آنجا
بر در پیر مغان پیشتر از صبح مرو — فیض ہا می رسد از سلسلۂ تاک آنجا

میرؔ جای کہ بہ تیران محبت می سوخت
صبح دیدیم بہ جا ماندہ کف خاک آنجا

الغرض عشق حقیقی اور اس کے متعلقات کے بارے میں انھوں نے سینکڑوں پُر تاثیر اشعار کہے ہیں۔ نیز وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود، فنا و بقا، وحدت و کثرت وجود و عدم، جبر و قدر اور

ہستی و نیستی ایسے مشکل و پیچیدہ مسائل پر بھی گفتگو کی ہے لیکن انداز وہی نرم و شیریں اور نرالا ہے۔ کہتے ہیں ؎

گفتگو می سخت ما ہم بی نزاکت نیست میر
در بغل دارد چو سنگ شیشہ مینا مشک ما

میر تقی میر کی غزلوں میں ہمت افزا پُر تمکنت ولولہ انگیز اور مایوسی کی ظلمت کو حوصلے کے نور سے لبریز کرنے والے اشعار بھی موجود ہیں۔ ان کے یہاں عشقیہ اشعار کی فراوانی ہے المناک اور حزنیہ شعروں سے تو ان کی پہچان ہی متعین ہوتی ہے باین ہمہ ولولہ انگیز اور شوخ ابیات کی بھی ان کے یہاں کمی نہیں۔ ان کے یہاں زندگی اور معاشرے کے گہرے مشاہدے سے اخذ کردہ بصیرت کے شواہد کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے اشعار میں اس دور کے تہذیبی اداروں، دربار، بازار اور خانقاہ کے اثرات کا امتزاج نظر آتا ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کا کلام اپنے دور کے نشیب و فراز کی عکاسی اور ہمعصر سماج کے مسائل کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

مردیم و مکان ہم شدہ ویران و نہ گفتی — کاین راہ گزر تکیۂ دریوزہ گری داشت
دل از پی او غرق بہ دریای بلا بود — وان گوہر تو سر بہ کنار دگری داشت

چون رنگ حنا میر یکا یک زمیان رفت
معلوم چو شد با کف پای تو سری داشت

میر کی شاعری نرم گفتاری سے عبارت ہے انھیں شاید بلند آہنگی پسند نہیں وہ ملائم لب و لہجہ کے غزل گو ہیں۔ صلابت کی جگہ لطافت، احتجاج کی جگہ خود سپردگی ان کے لہجہ اور طرز اظہار کو انفرادیت بخشتے ہیں۔ انھیں وضاحت کی جگہ کنایہ اور اجمال پسند ہے انھوں نے اپنی تخلیقی قوت سے اس دور کے غم و الم کو اپنی شاعری میں سمو کر اس کی ترجمانی کی۔ ان کی شاعری غموں کو ہضم کر کے نہ صرف انھیں ایک مثبت صورت دیتی ہے بلکہ انسان کو غم و نشاط کی کیفیت سے بلند کر دیتی ہے۔ ان کی سحر کار آواز صاف پہچانی جاتی ہے انھوں نے جو انقلابات دیکھے اور جو تکلیفیں زمانے کے

ہاتھوں اٹھائیں ان کا اثر صاف ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔ دہلی کی بربادی اور وہاں کے قتل عام کے واقعات کو بھی میرؔ نے اپنی شاعری میں جگہ دی اور تخلیقی شان برقرار رکھی۔ کہتے ہیں ؎

فلک زین گونہ خون بسیار کردہ است

عزیزان را بے آزار کردہ است

از ہر کہ سخن کردم گفتند کہ این جانیست　　از ہر کہ نشان جستم گفتند کہ پیدا نیست

میرؔ نے محبت اور انسانیت کو جلا بخشی غمِ عشق اور غمِ آفاق نے مل کر ان کے اشعار میں شعلہ کی سی لپٹ پیدا کر دی ہے ان کا ہر شعر شور انگیز ہے ان کے اشعار میں بلا کی سادگی اور سوز و گداز ہے۔ ہر لفظ تاثیر سے پُر ہے ان کے اس انداز میں ایک ندرت ہے، ایک سلیقہ ہے۔ ان کے اشعار میں خلوص، سچائی، سوز و گداز اور درد کا احساس کارفرما ہے اور عام انسانی اپیل کا جذبہ ہے۔ ان کے یہاں محرومی اور غمناکی کے اثرات سرتاپا نظر آتے ہیں۔ ان کے خیالات میں گہرائی، جذبات میں خلوص اور اظہار میں کیفیت ہے۔ حالات کی مصوری کرنے میں میرؔ اپنی اور ہماری انسانیت کو بے نقاب کر کے اس کی حقیقی صورت پیش کرتے ہیں۔ ان کے بکھرے ہوئے آنسوؤں میں ہمیں بحرِ حیات کی وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میرؔ نے براہ راست سماجی، معاشی اور سیاسی مضامین کو بہت کم باندھا ہے انھوں نے اپنے عہد کے مظالم اور انسانی شخصیت کی شکست و ریخت کو محبوب کے پردے میں بیان کیا ہے اور اس پردے کو اٹھانے کی خود ہی ترغیب دی ہے۔ کہتے ہیں ؎

بہ وعدہ ات ندہم دل کے اعتبار تو نیست

وفا است رسم قدیمی کہ در دیار تو نیست

کدام دل کہ در ایام تو ندارد داغ

کدام دیدہ کہ پر خون نہ روزگار تو نیست

از داغ گل بہ سینۂ من دستہ دستہ است

واز اشک لالہ گوں مژہ ام غنچہ بستہ است

تنہا نیامدہ است بہ شور از تو عندلیب

گل ہم بہ روزگار تو در خون نشستہ است

ان کے احساس کی شدت اور اس کے ساتھ گہرے انسانی شعور نے ان میں ایک آفاقی اور کائناتی رنگ پیدا کر دیا ہے اس لئے ان کا اثر ہمہ گیر اور لازوال ہے۔ میرؔ کی یہی مشاہدات و تجربات ہیں جو انھیں غم کے قدرِ مشترک ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔

میرؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزلوں میں بھی اس فتنہ و فساد کو موضوع بنایا۔ انھوں نے کہیں درد بھرے لہجہ میں اور کہیں طنز کے پیرایہ میں اپنے احساسات اور تاثرات کی ترجمانی کی۔ اپنے ہم عصر اور مابعد فنکاروں کو یہ سبق دیا کہ زلف و رخسار اور چشم و دہن کے مضمون کی طرح سیاسی، معاشی اور معاشرتی پہلو بھی فنکاری کی توجہ کے مستحق اور بیان کے لائق ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

نی فقط کوہکن از عشق بہ تنگ آمدہ است

پای بسیار وفا پیشہ بہ سنگ آمدہ است

بہ جہان آمدن تست گذشتن ز جہان

ہر کہ پیدا شدہ در کام نہنگ آمدہ است

آن چہ از مردم چشم تو دلم دیدہ ورفت

کی چنین جور ز کفار فرنگ آمدہ است

لوطی چند مگر زائر خاک میرؔ اند

کہ بگوئم ہمہ شب شور شلنگ آمدہ است

میرؔ نے شاعری کے پردے میں اپنے غموں کی جو داستان بیان کی ہے اس کے ایک ایک لفظ سے حسرت و یاس ٹپکتی ہے۔ ان کا کلام سوز و گداز اور درد و اثر سے لبریز ہے انھوں نے آپ بیتی میں جگ بیتی کا لطف پیدا کر کے غزل کی چمن بندی کی ہے۔ یہ اشعار میرؔ کی اصل کیفیت

کی ترجمانی کرتے ہیں۔

آوارہ گرد عشق تو چشم پُر آب دار — ہر جا کہ رفت گریہ بہ رنگ سحاب داشت
شبہا بہ ما نشست و سر حرف وانہ شد — آن ناز پیشۂ روی سخن در نقاب داشت
من در نفس شماری و آن سرو خوش خرام — مستغنیانہ رفت کہ باخود حساب داشت
زان پیشتر کہ نرگس مست تو وا شود — احوال غم کشان محبت خراب داشت
دیشب بہ یاد زلفی کہ می سوختی دلا — دردِ جگر چو مار سیہ پیچ و تاب داشت
بی پردہ اش بہ جلوہ تماشا نکردہ ایم — با این ظہور حسن قیامت حجاب داشت
کاغذ بہ پیش قاصد من سوختی مگر — پیغام سینہ سوختگان این جواب داشت
معلوم شد کہ منزل مانیست این چمن — بر ہر کسی کہ چشم فتاد اضطراب داشت
آب روان و رنگ گل و باد صبح گاہ — ہر یک چو باز ماندہ مسافر شتاب داشت

آیا چہ شد کہ میرؔ گدای شراب شد
دیروز این جوان عزیز احتساب داشت

ان اشعار کے الفاظ ملائم دھیمے سلیس اور سادہ ہیں لیکن ان کی تہ میں غضب کا جوش اور درد چھپا ہے۔ الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب اور ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کرتی ہے اس کے ساتھ اگر سادگی اور پیرایہ بیان بھی عمدہ ہو تو شعر کا رتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ میرؔ کے ان اشعار میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کا کلام ایسا دردانگیز ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر چوٹ سی لگتی ہے جو لطف سے خالی نہیں ہوتی ان کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں سادگی اور صفائی سے پیش کرتے ہیں۔ خاص طور سے ان کے اشعار میں خلوص وصداقت، معمولیات کی کامیاب مصوری، عام لہجہ، پیرایہ ہائے ادا کی مانوسیت اور صوتی محاسن وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ میرؔ کی شاعرانہ عظمت کا اس سے بہتر ثبوت نہیں مل سکتا۔ انھوں نے شعر کے پردے میں اپنے غموں کی داستان جس انداز سے

بیان کی ہے وہ انداز دوسرے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ میرؔ کا انداز اپنا انداز ہے اور اسے کوئی نہیں اپنا سکا۔ ان کی زبان عام فہم اور سادہ ہے ان کے اسی انداز بیان نے ندرت پیدا کر دی ہے جس سے شعر میں سادگی کے ساتھ ساتھ جذبات کی شدت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہ اشعار میرؔ کے فن کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں ان میں ایک شور ہے ایک ولولہ ہے اور زندہ رہنے کی جو امنگ ہے وہ ان کے جذبات کی صحیح عکاسی و ترجمانی کرتی ہے۔ شگفتگی اور زندہ دلی میرؔ کی تقدیر میں نہیں تھی وہ سراپا یاس و حرماں تھے اور یہی حال ان کے کلام کا ہے گویا ان کا کلام ان کی طبیعت اور سیرت کی ہو بہو تصویر ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ اصلیت اور حقیقت سے خالی نہیں وہ دور از کار استعارات بعید از قیاس مبالغے اور خلاف عادت امور سے پاک ہیں۔ وہ قلبی واردات اور کیفیات کو نہایت سادہ، شستہ اور صاف زبان میں ایسے دلکش اسلوب سے بیان کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں وہ دل میں اتر جاتی ہے۔ غرض یہ کہ ان کا کلام بہ لحاظ فصاحت و روانی سہل ممتنع ہے۔ میری رائے میں کسی شاعر کے کلام کا ایک بڑا معیار اس کے کلام کی تاثیر ہے اور اگر اس معیار پر میرؔ کے کلام کو جانچا جائے تو ان کا رتبہ فارسی شعراء میں بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔

میرؔ کے کلام کے متعلق مولانا آزردہ نے لکھا ہے کہ ''پستش بغایت پست و بلندش بغایت دلبند است'' لیکن میری دانست میں میرؔ کے یہاں پستی بہت کم نظر آتی ہے اور اس حد تک نہیں جیسا کہ دوسروں کے یہاں ملتی ہے۔ ان کے اشعار کے الفاظ ملائم دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہ میں غضب کا جوش اور درد چھپا رہتا ہے اور سلیس اور معمولی ترکیب میں بھی کمال کر دیتے ہیں۔ ان کا پیرایۂ بیان غضب کا درد انگیز ہے یہ ان کا خاص کمال ہے اور یہی چیز ان کی شاعری کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا میرؔ کے کلام میں اخلاق اور حکیمانہ اشعار کی بھی کمی نہیں لیکن اخلاق ہو یا حکمت اندرونی کیفیت ہو یا بیرونی حالتِ انداز بیان وہی ہے نہایت معمولی اور سادہ الفاظ میں بڑے بڑے نکات اور بلند مضامین اس بے تکلفی سے کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔

انسان کا طرز بیان اس کی سیرت کا پرتو ہوتا ہے یہ مقولہ شاعر کے کلام پر اور بھی صادق آتا ہے لیکن غالباً کسی شاعر کے کلام پر اس کی طبیعت اور سیرت کا اس قدر اثر نہ پڑا ہوگا جتنا میرؔ کے کلام میں نظر آتا ہے۔ جو شخص میرؔ کے حالات اور ان کے اخلاق و سیرت سے واقف نہ ہو وہ ان کے کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے کی مدد سے ان کے انداز ان کی طبیعت کی افتاد اور مزاج کو سمجھ سکتا ہے۔ ان کے ایک ایک لفظ، طرز بیان، ترتیب و بندش میں ان کے قلبی واردات و احساسات کا نقشہ کھینچا ہوا ہے۔ نازک مزاجی اور خودداری کی بدولت وہ زندگی سے بیزار رہے اور ہمیشہ دکھ درد سہتے اور خونِ جگر کھاتے رہے اور اسی خونِ جگر سے انھوں نے زمینِ شعر کو سینچا۔

میرؔ کی شاعری اس لئے بھی ہماری بہت بڑی دولت ہے کہ ان کے یہاں ہمارے تینوں تہذیبی ادارے بازار، خانقاہ اور دربار اس طرح ملے ہیں کہ اس دور کی تمام سماجی حقیقتیں اس نگار خانے میں جلوہ گر ہو جاتی ہیں۔ ان کے یہاں شروع سے آخر تک ایک لہجہ اور آواز ہے۔ آوازوں کا تصادم یا کشمکش نہیں۔ میرؔ کی غزلوں میں ہماری مشترک تہذیب کا جلوہ صد رنگ ملتا ہے۔ ان کے یہاں صرف شباب کے ہیجان کی داستان ہوتی تو اس کی اتنی اہمیت نہ تھی ان کے یہاں یہ ایک وضع جنون بن گئی ہے اور اس کے وضع جنون میں عاشقی ہی نہیں زندگی کی کچھ بڑی قدریں بھی شامل ہیں۔ ان کے یہاں چونکہ افکار کے ساتھ شاعرانہ اظہار بھی ملتا ہے۔ اس لئے اظہار کا حسن بعض اوقات فکر کی لطیف تابانی کی طرف سے توجہ ہٹا دیتا ہے۔ جس طرح فکر کو محدود معنوں میں لینے کی وجہ سے ہم میرؔ کے میلان فکری پر پوری توجہ نہیں کر سکے اسی طرح فن کے محدود تصور نے میرؔ کے فن کی عظمت واضح نہ ہونے دی۔ میرؔ کے لہجے کی خوش آہنگی اور شیرینی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ ان کی شاعری کو ہم اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ اور اس کے پس منظر کی روشنی میں ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے یہاں فن پر بہت سے پردے ہیں اور نہ فکر میں زیادہ پیچ و خم اس لئے وہ اپنے ہم عصروں سے زیادہ ہمیں بصیرت عطا کرتے ہیں۔ عشق و عاشقی کے مختلف کیفیات اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ میرؔ کی غزل میں تصوف اور اس کے

مختلف مسائل کی ترجمانی بھی کم نہیں ہے ان کی ذہنی نشو ونما صوفیانہ ماحول میں ہوئی اس لئے معرفت الٰہی کا رنگ ان کی طبیعت میں رچ بس گیا۔ چنانچہ انھوں نے تصوف کے مختلف مسائل کو اپنی غزلوں میں بخوبی بیان کیا ہے ان کے یہاں حیات وکائنات کے مسائل کی ترجمانی کا فلسفیانہ رجحان بھی ملتا ہے ان مسائل میں انھوں نے زندگی کی بے ثباتی کو شدت سے محسوس کیا اور اس کی ترجمانی بھی مختلف انداز اور مختلف زاویوں سے کی ہے۔ اس میں ان کی اس ذہنی کیفیت کو بھی دخل ہے جو تمام تر ایک انحطاط پذیر اور زوال آثار سماجی ماحول کی پیداوار تھی۔ ان کی غزلوں میں جو میٹھے درد کا احساس ہے وہ غزل کی طبیعت اور اس کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کا یہ اثر ہے کہ میرؔ غزل کو بڑی خوبی سے برتنے میں کامیاب ہوئے ہیں ایک ایک مصرعہ میں انھوں نے جہان کا غم سمویا ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں انفرادی اور اجتماعی پریشانی اور دلّی کی ویرانی کے دردناک انداز میں نقشے کھنچے ہیں ان اشعار میں بڑی چابک دستی اور فنکاری کا مظاہرہ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے احساسات، تاثرات اور مشاہدات کے اظہار کے لئے کہیں کہیں نادر تشبیہیں، اچھوتے استعارے اور منفرد علامتیں استعمال کی ہیں۔ غمِ ذات اور غمِ کائنات سے مقابلہ کرتے ہوئے ان کی شخصیت کا خمیر اٹھا جس کے نقوش ان کی شاعری اور ان کے مزاج میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہیں داخلی اور خارجی حالات نے میرؔ کو حد درجہ حساس اور نازک مزاج بنا دیا۔ یقیناً میرؔ کا کلام بلند ش بلند اور پستش پست ہے جہاں بلندی ہے تو بے تحاشا بلندی ہے اور جہاں پستی ہے تو بے حد پستی ہے۔ کلام میرؔ واقعی بلندی کا احساس تو دلاتا ہے لیکن وہ پستی جسے پستش پست کہا جا سکے میرے خیال میں معدودے چند مقامات پر ہی محسوس ہوتی ہے وگرنہ میرؔ کی معمولی باتوں میں بھی رموز پوشیدہ ہیں جو شاعرانہ والہیت، کیفیت، ربودگی، دلسوزی اور گداز میرؔ کے کلام میں ہے وہ انھیں عظیم فنکار تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ میرؔ کو زندگی کی بے ثباتی کا شدید احساس ہے لیکن بے ثباتی کا یہ شدید احساس میرؔ کو قنوطی بناتا ہے نہ انھیں موت سے خوف آتا ہے۔ ان کے اشعار کی دلسوزی حزنیہ کیفیات، المناک فضا، خستگی، ربودگی اور نشتر کی طرح دل میں اتر

جانے والی خاصیت پر جتنا لکھا جائے کم ہے۔ الفاظ کے تخلیقی استعمال پر انھیں مکمل قدرت حاصل ہے لہجے کی ملائمیت ان کا خاص وصف ہے۔ ان کی غزلوں میں طلسمی کیفیت اور تاثیر کا راز یہی ہے کہ میرؔ نے غمِ ذات کو کائنات سے ہم آہنگ کرلیا تھا یہی سبب ہے کہ اپنی غزل میں جب میرؔ دل کی بھڑاس نکالتے ہیں تو ان کے اشعار پر غم زدہ کے زخموں کا مرہم بن جاتے ہیں انھیں پڑھتے ہوئے قاری کو ایسی انسیت اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے کہ لگتا ہے کہ ایک غم زدہ دوسرے غم زدہ کا غم بانٹنے کی کوشش کررہا ہو اور تسلی دے رہا ہو حسرتناک جذبات اور المیہ کیفیات کی ترجمانی کا جیسا سلیقہ میرؔ کو آتا ہے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہ ہوا۔ ہر چند کہ میرؔ اپنے طرزِ بیان میں سلاست اور شائستگی، سادگی اور خلوص کو فوقیت دیتے ہیں۔ وہ سہل ممتنع کے بادشاہ ہیں پھر بھی ان کی شاعری میں حیات اور کائنات کے رنگارنگ مظاہر اور نو بہ نو تجربات کی جلوہ گری نظر آتی ہے اور وہ نازک سے نازک موضوع اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیال اور عمیق ترین احساسات کو بالکل سامنے کی بات بنا دیتے ہیں۔ میرؔ کے کلام میں جو سوز و گداز حزن و ملال کی کیفیات میں المناک فضا اور حسرت ناکی ہے ان سب کے پیشِ نظر کچھ ناقدین نے انھیں قنوطی قرار دیا ہے جو سراسر غلط ہے۔ میرؔ کے وہ شعر بھی جو حزنیہ کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں قاری کو مایوسی اور ناکامی کے دائرے سے نکال کر زندگی کا حوصلہ دیتے ہیں اسے احساس دلاتے ہیں کہ اس کارگاہ حیات میں صرف وہی محرومی و شکست کا شکار نہیں ہیں زندگی دراصل دردِ دل سے عبارت ہے اور خلقِ خدا میں اس کی طرح بے شمار زخم رسیدہ اور آفت گزیدہ افراد موجود ہیں جنہیں باہم ایک دوسرے کے غم واندوہ کو محسوس کرنے اور بے حوصلگی سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

میرؔ کے کلام میں عصری حسیت کی جھلکیاں بھی جا بجا نظر آتی ہیں کیونکہ کوئی بھی فنکار اپنے معاشرے اور اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہوکر تخلیق فن کر ہی نہیں سکتا فن کو حقیقت کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔

میرؔ عام فہم زبان میں مضمر تخلیقی قوت اور ابلاغ کی وسعتوں سے روشناس کرتے ہیں ان

کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعر کہنے کے لئے دوراز کار مضامین اور فلسفیانہ انداز بیان لازمی نہیں سامنے کی باتوں میں بھی شاعر اپنے برتاؤ اور احساس کی شدت سے شعریت اور حرارت پیدا کرسکتا ہے اور سادہ اسالیب کے وسیلے سے بھی فلسفیانہ افکار کی گہرائیوں تک پہنچنا ممکن نہیں ہے البتہ ان کے لئے تخلیقی اپج اور خلوص تخیل کی ضرورت ہے۔ میرؔ کے اشعار صحیح الفاظ کے استعمال ان کی بازگشت اور نغمگی کی اہمیت سے ہمیں آشنا کرتے ہیں۔ لفظوں کی تکرار اور اصوات کی آنچ سے شاعری کتنی معنی خیز اور پُر تاثیر بنائی جاسکتی ہے اسے کوئی میرؔ سے سیکھے۔ لہجے کے آہنگ سے استفادہ کرنا اور غنائی اثر پیدا کرنا، نرم اور کرخت الفاظ کے برمحل استعمال پر قدرت حاصل کرنا بھی میرؔ سے سیکھا جاسکتا ہے۔ الفاظ کی گھن گرج کے بغیر شاعری میں عظمت کا احساس دلانا بھی میرؔ کا وصف ہے۔ تلازمات کی پہلو داری اور تشبیہات کی ندرت سے میرؔ کے اشعار میں جمالیاتی حسن اور مفاہیم کی پیچ داری میں اضافہ ہو جاتا ہے ان کے اشعار میں عصری حسیت کے پہلو بہ پہلو حسیاتی تجسیم کاری اور پیکر تراشی کے خوبصورت نمونے قدم بہ قدم دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ روانی، سلاست، نغمگی اور بے ساختگی بھی ان کے اوصاف میں شامل ہیں۔ علامتوں کا حسن اور بلاغت کی تہہ داری اکثر ابیات میں تاثیر اور معنویت کے جادو جگاتی ہے۔

میرؔ کے اشعار جذبہ محبت کی عظمت اس کی ہمہ گیری اور حیات کائنات میں عشق کی شوریدگی کے بیان سے پُر ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق اور مخلوق کے رشتے اور کائنات کے نظام کا محور صرف اور صرف عشق کا جذبہ ہے ان کے اشعار سے اس معاشرے کے انحطاط اخلاقی پستی اور بدحالی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے جس میں میرؔ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان سے میرؔ کی حسن مزاج کا بھی ثبوت ملتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہر حال ہمارا یہ عظیم شاعر اور صوفی منش انسان بھی بشری خامیوں کا حامل تھا اور منتقمانہ جذبے کے تحت بھی شعر کہہ سکتا تھا۔ میرؔ کی شاعری میں لہجے کا دھیما پن ہے جس سے حیات و کائنات کی عظمت، رعب و جلال کا اندازہ ہمیں ہوتا ہے ان کے لہجے کی نرمی دنیا کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔ ان کے کلام کی سب سے اہم حقیقت

یا محرک ان کا خلوص تخیل ہے۔ غنائی شاعری میں یہ خلوص تخیل دنیا کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے اور یہی وہ مرکز سوز و ساز ہے جہاں خود الفاظ کے پر جلنے لگتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری میں ہم سکوت سرمدی کے دل کی دھڑکنیں سنتے ہیں۔ میرؔ نے تغزل کے جو آداب سکھائے ہیں انھیں کسی زمانے میں ترک نہیں کیا جا سکتا۔ سید عبداللہ کا خیال ہے کہ میرؔ لکھنے سے زیادہ کہنے کے قائل ہیں اس لئے وہ بات اور گفتگو کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ یعنی وہ شاعری کے تحریری پہلو سے زیادہ سننے سنانے کے انداز کے نمائندہ ہیں اور یہی انداز ان کی اردو فارسی دونوں شاعری میں ملتا ہے۔ ان کا کلام بہ محافظ فصاحت و روانی سہل ممتنع ہے اور سہل ممتنع کا تجزیہ اور اس کی خوبیوں کو بیان کرنا ایک مختصر سے مقالہ میں ممکن نہیں۔ میرؔ کی موسیقیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ وہ قافیہ اور بحر مترنم لاتے ہیں اس کے علاوہ ردیف کی تکرار نیز ان کی طوالت سے بھی عمدہ کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ان کی آواز کا جادو ہر عہد میں محسوس کیا جاتا رہا ہے ان کے لہجے کی خوش آہنگی اور تاثیر اور دردمندی کبھی ماند نہیں پڑ سکتی۔ میرؔ ایسے صناع ہیں کہ ان کی صناعی آسانی سے نظر نہیں آتی کم سے کم لفظوں سے وہ ایسی تصویر بناتے ہیں اور داخلی محسوسات کی ایسی ترجمانی کرتے ہیں کہ دل پر چوٹ لگتی ہے ان کی شاعری میں ایسی دل آویزی اور دل آسائی ہے جو اور کہیں نہیں ملتی۔ ان کی شاعری دردمند انسانیت کی آواز ہے ان کی چشم خون بستہ انھیں ہر دل سے ضرور قریب کر دیتی ہے لیکن ان کا سمجھنا آسان نہیں ان کی بصیرت تہ در تہ ہے انھوں نے اپنی موجِ سخن کو بلاوجہ صدرنگ نہیں کہا تھا وہ اکثر ثقیل الفاظ، نامانوس تراکیب اور دور از کار تشبیہات استعمال کئے بغیر مضامین میں گہرائی، پہلوداری اور تہ داری پیدا کر دیتے ہیں جس کا انھیں خود احساس ہے اسی لئے کہتے ہیں ؎

بی تامل کی شناسی طرز گفتار مرا
دیدہ نازک کن کہ فہمی صرف تہ دار مرا

ان کے اشعار میں زیر و بم متناسب رہتے ہیں۔ لفظوں کی نشست و برخاست سے وہ باخبر ہیں ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ معمولی الفاظ سے غیر معمولی کام لیتے ہیں۔

میرؔ کی شاعری کے اسلوب پر جتنا غور کریں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ وہ لفظوں کا مصور ہے، ایک نہایت ماہر فنکار جو کینوس (Canvas) پر موقلم سے ایک تصویر بناتا ہے وہ جانتا ہے کہ اس تصویر میں جہات (Dimensions) کس طرح دکھائے جائیں کون سا رنگ شوخ ہو کون سا ہلکا، کہاں وضاحت کی ضرورت ہے، کدھر ابہام درکار ہے۔ میرؔ آواز اور نغمگی کے زیر و بم سے جذبات و کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں اپنے ماحول کے علاوہ وہ انسان کی نفسانی کیفیات کا بھی گہرا اثر رکھتے ہیں ایک پریشان حال انسان حالتِ اضطراب میں کس طرح سوچتا ہے اور بعض ایسے امکانات پر بھی اس کی نگاہ پہونچتی ہے جو عام حالت میں پیش نظر نہیں ہوتے۔ میرؔ نے اپنی شخصی کیفیتوں کو اس طرح بیان کی ہے کہ وہ پورے ماحول کا آئینہ بن کر ہمارے سامنے آئی ہیں اور ماحول یا معاشرت کی تصویر کشی اس طرح کی ہے کہ ہم ان کی ذات کو اس میں آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔

اجمال میں تفصیل میرؔ کا خاص وصف ہے وہ کسی نہایت وسیع شدید اور بے پناہ احساس کے صرف ایک گوشے سے نقاب اٹھاتا ہے اور پوری تصویر سامنے آجاتی ہے میرؔ ایسے تناسب سے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ان کے ربط باہمی سے خیال کا ایک بڑا کینوس بن جاتا ہے اور ہر لفظ دوسرے سے متناسب لفظ کی قوت میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

میرؔ سادہ لفظوں میں ایک پوری کائنات پوشیدہ کر دیتے ہیں۔ فلسفۂ عشق، کیفیت ہجر و وصال، عاشق کے طویل جذباتی سفر، اس کی تنہائی اور بے چارگی کے مختلف پہلوؤں کو چند لفظوں میں سمیٹ لیتے ہیں۔ میرؔ کے نزدیک عشق خود ہی اپنا مقصود ہے اس میں ہجر و وصال کو کچھ اہمیت نہیں عاشق کے لئے دونوں مہلک ہو سکتے ہیں۔ اتنے بڑے مفہوم کو وہ محض دو مصرعوں میں بند کر دیتے ہیں وہ کسی دوسرے شاعر سے ممکن نہیں۔

صاحب طبقات الشعراء نے میرؔ کو ''محاورہ دان متین'' کا لقب شاید اسی لئے دیا تھا میرؔ زندگی کی عام اور خاص حالتوں کی مصوری کرتے ہیں اور لطیف سے لطیف جذبات کو نہایت موثر

طریقے سے ادا کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ میرؔ ایک خوش فکر شاعر ہیں ایسا نہیں کہ ان کے فکر میں بلند پروازی نہ ہو یا وہ محض تقلید ہی کے سہارے زندہ ہوں جہاں تک انھوں نے شاعری کی قدیم روایات کی پاسداری کی ہے وہ تقلید کرتے بھی نظر آتے ہیں لیکن ان کی اجتہادی شان ان کی تقلید پر غالب رہتی ہے۔ ان کی شاعری میں تلاش الفاظ کی بڑی اہمیت ہے وہ لفظوں کے مزاج سے واقف ہیں اور معنی کے نہایت نازک فرق کو خوب سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ ایہام کی طرف میلان یا الفاظ کی بازی گری شعر کو بے رتبہ کر دیتی ہے۔ اعلیٰ درجہ کی شاعری کے لئے اسلوب کی حیثیت ثانوی ہے اصل چیز شعر کی معنوی فضا کا رکھ رکھاؤ ہے یعنی اس میں لطافت ہو، دردمندی ہو، خیال کی ندرت ہو اور فکر کی گہرائی ہو۔ لہٰذا میرؔ کی شاعری رسمی معنی میں نگار خانہ نہیں بلکہ تخلیق شعر کا ایسا تہ در تہ اور پیچ در پیچ طلسمات ہے جس میں ہر عہد اور ہر نسل اور ہر وادی و آبادی کے لوگ اپنی اپنی حسرتوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی یہ گونج سنتے رہیں گے۔

میرؔ اور آگرہ

عام خیال ہے کہ محمد تقی المتخلص میرؔ نے تقریباً نوے سال کی عمر پائی جس میں آخر عمر کے تقریباً تیس اکتیس سال لکھنؤ میں گزارے۔ تقریباً پینتالس سال دہلی میں اور ابتدائی تیرہ، چودہ سال آگرے میں یعنی اکبرآباد کی سرزمین پر جہاں وہ پیدا ہوئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق انتخاب کلام میر کے مقدمے میں لکھتے ہیں :

> 'اگرچہ میر صاحب اکبرآباد میں پیدا ہوئے اور ان کے بچپن کا زمانہ بھی وہیں گزرا لیکن بعد میں وہ دلّی چلے آئے اور دلّی ہی کو اپنا وطن بنالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو دلّی سے نہیں بلکہ دلّی کو ان کے تو وطن سے فخر ہے۔ پھر دلّی کے ہی ہو گئے اور دلّی ہی کے کہلائے اور ان کی زبان بھی جو اس زمانے میں مایۂ افتخار اور شرافت کی ایک علامت سمجھی جاتی تھی۔ دلّی ہی کی تھی۔''

ایسا اس لئے ہوا کہ عمر کا سب سے زیادہ حصّہ دلّی میں گزرا اور سب سے کم حصہ آگرے میں گزر سکا اس لئے میرؔ دہلوی کے طور پر زیادہ جانے گئے اور اکبرآبادی کے طور پر ان کی پہچان نہ بن پائی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سچ یہ ہے کہ میرؔ کا سب سے گہرا اور جذباتی رشتہ آگرے سے رہا۔ اس کی ایک فطری وجہ آگرے میں ان کی پیدائش اور بچپن کا گزرنا ہے اور ہم سب جانتے ہیں اور خاص طور پر ماہرینِ نفسیات کہ بچپن کے لمحات اور واقعات تربیت اور فطرت ساری عمر پیچھا نہیں چھوڑتے۔ شخصیت کی بنیاد پڑتی ہے، فکر و خیال کے سانچے ڈھلتے ہیں۔ میرؔ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اور کچھ زیادہ ہی ہوا۔ میرؔ کی غم زدگی اور خستگی جس نے آگے بڑھ کر ایک مخصوص قسم کی سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ تکلیفیں، پریشانیاں اور جنون جس نے آگے بڑھ کر شعور کی پرورش کی۔ گھر کا

پروفیسر علی احمد فاطمی، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

صوفیانہ وعبادت گزار ماحول جس نے آگے بڑھ کر تصوف اور تجمل کا کام کیا۔ اس پر مستزاد میرؔ کا اپنا مزاج و مذاق۔ افتادِ طبع اور سلیقہ مندی جسے بھی کسی طرح سے گھر اور خاندان سے الگ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ میرؔ کی بنیادی فہم اور نفسیات کو سمجھنے کے لئے ان کے اجداد اور بالخصوص والد کے صوفیانہ کردار کو سمجھنا اور اس سے زیادہ اس آزاد اور آثار کو سمجھنا کہ جس کے بطن سے انتشار اور اس غم کو بھی سمجھنا جس کی کوکھ سے نشاطِ غم کے عناصر جنم لے رہے تھے اور ان سب کی بنیاد آگرے میں ہی پڑی۔ اس لئے میرؔ اور آگرہ کے رشتوں اور اس کی نزاکتوں کو سمجھنا ضروری ہے کہ یہ رشتہ محض ایک فرد اور شہر کے درمیان کا نہیں بلکہ ایک فکر اور تہذیب کے درمیان کا ہے۔ ان عوامل اور محرکات کا ہے جو تخلیقی سرچشمے بن کر غزلیہ شاعری کی رگوں میں سما گئے، بقول آل احمد سرورؔ: ''میرؔ کی شاعری ایک بُت ہزار شیوہ کی طرح ہے۔ میرؔ اس لئے بڑے شاعر نہیں کہ وہ ماحول کے مصور ہیں وہ اس لئے بڑے شاعر ہیں کہ ان کے اشعار اس بھرپور احساس سے لبریز ہیں جو زندگی کی گہری بصیرت سے حامل ہوتا ہے۔''

اس تحقیق سے سبھی اتفاق کرتے ہیں کہ میرؔ کے اجداد ملک حجاز سے تعلق رکھتے تھے پھر ہجرت کر کے ہند میں دکن پہنچے کچھ عرصہ قیام کر کے تلاشِ معاش میں شہر احمد آباد گئے۔ خاندان کا ایک حصہ تو وہیں رہ گیا اور جو بس نہ سکا وہ اکبر آباد کی طرف چل پڑا کہ یہ شہر ان دنوں مغلوں کی وجہ صنعت و تجارت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ذکر میرؔ کی ابتداء میں ہی میرؔ رقمطراز ہیں :

> '' میرے بزرگ اپنی قوم و قبیلے کے ساتھ زمانے کی نامساعدت کے باعث کہ ان اوقات میں صبح بھی شام نظر آتی ہے۔ ملکِ حجاز سے رختِ سفر باندھ کر دکن کے سرحد پر پہنچے راہ میں انھوں نے بڑی کڑیاں جھیلیں اور پاپڑ بیلے اور وہاں سے احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے۔ بعضوں نے جی چھوڑ کر وہیں ڈیرے ڈال دئے اور کچھ نے آگے بڑھ کر روزگار تلاش کرنے کی ہمت کی۔ چنانچہ میرے

جدِ کلاں نے مستقر خلافت اکبرآباد میں اقامت اختیار کی۔ یہاں
آب وہوا کی تبدیلی سے بیمار پڑ گئے اور جہانِ آب وگل کو خیر باد کہا۔
ان سے ایک لڑکا یادگار رہا۔ جو میرے دادا تھے۔''

(میرؔ کی آپ بیتی، ذکر میرؔ کا اردو ترجمہ، ص ۵۷)

میرؔ کے دادا اکبرآباد کی فوج میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہوئے۔ پچاس برس کے ہوئے کہ ذہنی توازن میں خلل پڑا، علاج کرواتے رہے۔ اسی درمیان ملازمت کی ذمہ داری کے تحت گوالیار جانا پڑا وہیں بیمار پڑے اور انتقال کر گئے۔ ان کے دو لڑکے تھے بڑے لڑکے کو بھی خلل دماغ تھا جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔ چھوٹے لڑکے میرؔ کے والد تھے جن کا نام محمد علی تھا۔ مزاج میں فقیری اور درویشی تھی۔ اس زمانے میں آگرے میں شاہ کلیم اثر ممتاز ولی تھے ان کے علم وفضل، کشف وکرامات کے بڑے چرچے تھے۔ محمد علی کا درویشانہ مزاج ان کے قریب لے گیا اور بقول جمیل جالبی :''جنھوں نے شاہ کلیم اثر اکبرآبادی سے علوم متداولہ کی تحصیل کر کے درویشی اختیار کر لی اور اپنے زہد وتقویٰ کی وجہ سے علی متقی کے خطاب سے موسوم ہوئے۔''

اپنے والد کے بارے میں میرؔ خود لکھتے ہیں :

''وہ جوانِ صالح اور عاشق پیشہ تھے۔ دل میں عشق کی
گرمی رکھتے تھے۔ علی متقی خطاب سے ممتاز ہوئے۔ روز وشب
خدا کی یاد میں رہتے تھے خدا نے انھیں کبھی شرمندہ نہ کیا کبھی
موج میں آتے تو فرماتے۔ بیٹا عشق اختیار کرو، عشق ہی اس
کارخانے میں متصرّف ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظم کل نہیں رہ
سکتا تھا، بے عشق زندگی وبال ہے عشق میں جی کی بازی لگا دینا
کمال ہے، عشق بناتا ہے، عشق ہی کندن کرتا ہے، دنیا میں جو
کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔

بے عشق نیاید بود، بے عشق نیاید زیست
پیغمبر کنعانی، عشق سپرے دارد

حساس میرؔ کا بچپن کیا اس نصیحت کو فراموش کر پایا۔ میرؔ کے عشق اور تصور عشق کی بنیاد تو والد کی گود میں ہی پڑ گئی۔ والد کی زبانی فارسی کا یہ شعر اور میر کی زبانی اردو میں یہ شعر ؎

یہ نہ ہووے تو نظم کل اٹھ جائے
پیچھے ہیں عاشقاں، خدا ہے عشق

یا یہ اشعار ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں پھر رہا ہے عشق

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ

عشق ہے تازہ کارِ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

میرؔ کے والد کی بزرگی کے کئی واقعات ہیں جو ذکرِ میرؔ، آبِ حیات اور دیگر کتابوں میں ملتے ہیں جن کا تفصیلی ذکر یہاں ممکن نہیں۔ عرض مدعا یہ ہے کہ ایسے ہی صوفیانہ ماحول میں میرؔ ۲۰ شعبان ۱۱۲۵ ھجری ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ لڑکپن کے کچھ مطالبات اور خواہشات فطری ہوا کرتے ہیں۔ کھیل کود فطری، میر بھی ملوث ہوئے تو ایک دن کا واقعہ خود میرؔ کی زبانی سنئے :

''ایک دن اشراق کی نماز کے بعد میری طرف توجہ فرمائی اور مجھے کھیل کود میں محو پایا بولے۔ بیٹا زمانہ بہتا ہوا وقت ہے یعنی بہت کم فرصت،

اپنی تربیت سے غافل نہ رہو، راستے میں بڑے نشیب و فراز ہیں دیکھ بھال کر چلو۔ یہ کیا کھیل رہے ہو کس واہیات میں پھنسے ہو، ارے اس سے لو لگاؤ آسمان جس کی رنگیں خرامی کی بلائیں لیتا ہے اس کو دل دو جس کی ہر آن پر دل اور جانیں واری ہوں۔ اس گل کی بلبل بنو جو ہمیشہ بہار ہے۔ اس سادہ پر مٹو جو سدا سہاگ ہے۔ آسمانِ دررنگ کی چال کسی کے لئے بدلتی نہیں، جلدی کرو۔ فرصت کو غنیمت جانو اور اپنے تئیں پہچان لو۔''

والد صوفی فقیر تھے فقیرانہ سفر بھی کرتے تھے لاہور دہلی وغیرہ جاتے رہتے۔ ان کی غیر موجودگی میں کھیل کود جاری رہے اس عمل میں ان کی ملاقاتیں ہم عمر خوبصورت نوجوانوں سے ہوئیں۔ دوستی اور رشتے بھی بنے طرح طرح کے واقعات رونما ہوئے۔ عشق کی دیگر گرہیں بھی کھلیں جس کا ذکر وہ بے محابا اپنی سوانح میں کرتے ہیں۔ سید زادے سے ملاقات، امان اللہ بی بی، احسان اللہ سے ملاقات، درویش کے ارشادات، بایزید سے ملاقات، چچا کی وفات اور پھر آخر میں والد محترم کی وفات، یہ سب کچھ آگرے میں ہوا۔ ملاقات میں مسرت اور وفات میں اذیت اور غربت و افلاس الگ سے۔ بچپن سے ہی میرؔ ان دونوں ذائقوں سے آشنا ہوتے رہے لیکن بعد کا ذائقہ کچھ زیادہ ہی حاوی رہا۔ جس نے حیات کے کام و دہن میں تلخی بھر دی۔ والد کی وفات (۱۷۳۲ء) کے وقت میرؔ کی عمر محض گیارہ سال کی تھی کم عمری میں چچا اور باپ کے انتقال نے غیر معمولی مایوسی اور محرومی سے ہمکنار کیا۔ آل احمد سرورؔ لکھتے ہیں :

''میرؔ کو بچپن ہی میں مہربان چچا اور شفیق باپ کی موت کی وجہ سے محرومی کا احساس ہوا۔ بھائی نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا چنانچہ محرومی کے احساس میں ظلم کا احساس بھی شامل ہو گیا۔''

غریبی اور محرومی کا احساس صرف گیارہ برس کی عمر میں۔ حساس اور معصوم ذہن پر کیا

گزری اس کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں :

''والد کی موت کے بعد میں نے فلک کی بے مروتی دیکھی، زمانے کے ستم جھیلے نہیں نہیں فلک یا زمانے کا کیا قصور؟ میرا ہی ستارہ منحوس تھا کہ ایسے آفتاب کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔ جو کچھ میری قسمت نے کیا اپنے ہی ہاتھ کے سوا کسی کا ہاتھ اپنے سر پر نہ پایا۔ یعنی کسی کو سایہ گستر نہ پایا۔ میں نے اپنا اثاثہ غیرت (کی نگہداشت) کے لئے صرف کر دیا اور ہرگز کسی کے دروازے پر (سائل بن کر) نہ گیا اور میرے ہونٹ حرفِ طلب سے آشنا نہ ہوئے، میری آنکھ کسی طرف نہ اٹھی نہ میں نے کسی سے مدد چاہی نہ کسی نے میری دستگیری کی۔ یعنی خدائے کریم نے مجھے کسی کا شرمندۂ احسان نہ کیا۔ میں نے درویش کی نیاز دلا کر تبرک تقسیم کیا اور تمام کام خدا کے آسرے چھوڑ دیے۔ چھوٹے بھائی کو اپنا قائم مقام بنا کر روزگار کی تلاش میں اطرافِ شہر گھومتا پھرا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ یعنی وطن میں چارۂ کار نہ پایا ناچار غربت اختیار کی۔''

غور کیجئے کہ محض گیارہ برس کا بچہ تلاشِ رزق میں دہلی جیسے پرانے اور بڑے شہر اور دارالسلطنت پہنچتا ہے جلد ہی دہلی میں خواجہ محمد باسط کے توسط سے نواب صمصام الدولہ تک رسائی ہوئی۔ نواب میر کے والد کے معتقد تھے۔ والد کی وفات پر اظہارِ افسوس کیا اور کہا کہ ''مجھ پر اس شخص کے حقوق ہیں۔ ایک روپیہ روز میری سرکار سے دیا جائے۔'' اس اعلان سے میر خوش تو ہوئے لیکن یہ بھی کہہ اٹھے ۔ ''نواب صاحب اتنی مہربانی فرما رہے ہیں تو مجھے دستخط فرما کر بھی دے دیں کہ متصدیوں کو چوں چرا کی گنجائش نہ رہے۔ درخواست میں نے لکھ رکھی تھی جیب سے نکالی اچانک خواجۂ مذکور کی زبان سے نکلا کہ ''یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے۔'' یہ سن کر میں نے قہقہہ

مارا نواب نے میرا منھ دیکھا اور ہنسی کا سبب پوچھا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ فقرہ میری سمجھ میں نہیں آیا اگر یہ فرماتے کہ قلمدان بردار نہیں تو ایک بات تھی یا یہ کہنا بھی ٹھیک تھا کہ یہ نواب کے دستخط کرنے کا وقت نہیں۔ قلمدان کا وقت نہیں کہنا تو نئی ترکیب ہے قلمدان ایک لکڑی سے زیادہ نہیں وہ وقت اور غیر وقت نہیں جانتا۔''

جس وقت میرؔ نواب سے روبرو ہوئے ان کی عمر گیارہ بارہ برس سے زیادہ کی نہ تھی اس عمر میں زبان اور ترکیبِ زبان کا یہ شعور ظاہر ہے ان کی گھریلو تعلیم و تربیت کا ثمرہ تھا جو انھیں آگرے ہی میں نصیب ہوئے پھر وہ جرأت کہ جس سے مدد مانگنے گئے اس کی بارگاہ میں اسی کی زبان پر معترض ہوئے۔ یہ ایک جرأت مندانہ عمل تھا اور اس جرأت کا ظہور بھی ایک صوفی گھرانے کے ذکر و فکر کے۔ حوالے سے ہی ممکن تھا کہ بے نیازی اور بیخودی تصوف کے اعلیٰ جوہر ہوا کرتے ہیں جو میرؔ کے اپنے گھر اور اپنے والد سے ملے جو کہ آگرے میں تھا اور جو زندگی بھر ان سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔

۱۷۳۹ء میں جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا اس حملہ میں صمصام الدولہ فوت کر گئے جمیل جالبی لکھتے ہیں :

> ''جب صمصام الدولہ نادر شاہ سے جنگ میں زخمی ہوئے اور ۱۸ر فروری ۱۷۳۹ء کو فوت کر گئے تو یہ وظیفہ بند ہو گیا اور میرؔ اکبر آباد میں پھر سے بے سہارا ہو گئے۔''

(محمد تقی میرؔ ص۔۲۲)

آخری جملہ غور طلب ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ وظیفہ یابی کے درمیان میرؔ آگرے میں ہی رہے اور وظیفہ چھ سال تک ملتا رہا کہ چھ سال کی اس مدّت کے بارے میں محققین کے اشارے نہیں ملتے۔ یقین ہے کہ یہ مدت میرؔ نے آگرے میں گزاری کہ اس چھوٹی عمر میں دہلی جیسے بڑے شہر میں میرؔ کا مسلسل دہلی میں رہنا مشکل تھا۔ ذکرِ میرؔ میں ''پھر دہلی میں'' کے

عنوان سے لکھتے ہیں ۔

''اس انقلاب (حملہ نادر) کے بعد پھر سنگ دل زمانے نے مجھے ستایا۔ ان لوگوں نے جو درویش کی زندگی میں میری خاکِ کف پا کو سرمہ بناتے تھے اب مجھے نظروں سے گرادیا۔ ناچار دوبارہ دہلی پہنچا اور اپنے سوتیلے بڑے بھائی کے ماموں سراج الدین علی خاں آبرو کے احسانات کا بھاری بوجھ اٹھایا۔''

دہلی میں آرزو سے تعلقات، ناچاقیاں، میرؔ کی جنونی کیفیت، ملازمت، درّانی کا حملہ، ابدالی کے حملے، فرخ آباد کا سفر، دل کی بربادی وغیرہ میرے اس مختصر سے مضمون کا حصّہ نہیں ہیں لیکن یہ بھی ہے کہ یہ سب میرؔ کے اس ذہن اور نفسیات کی توسیع ہیں جس کی بنیاد آگرے میں پڑی۔ اس بار تقریباً ۲۲ برس دہلی میں رہے۔ تیسری بار ۱۷۶۲ء میں آگرہ واپس آئے۔ اس وقت تک میرؔ کی عمر تقریباً چالیس سال کی ہو چکی تھی۔ شعروشاعری کی غیر معمولی شہرت نے انھیں امام فن کا درجہ عطا کر دیا تھا لیکن دہلی کی سیاست، قتل وخون، لوٹ مار اور دربدری نے پرانے صوفی میرؔ کے بطن سے نئے سماجی میرؔ کو جنم دیدیا تھا۔ تصوف اور تعاطف شیر وشکر ہو گئے تھے۔

۱۷۶۲ء میں میرؔ تیسری بار اپنے وطن آئے تو ذکرِ میرؔ میں لکھ گئے۔

''میں اس تقریب سے تیس سال کے بعد اکبرآباد گیا۔''

نثار احمد فاروقی نے اس کی تصحیح کچھ یوں کی ہے۔

''میرؔ نے تیس سال کے بعد اپنا آگرے جانا لکھا ہے لیکن واقعات کی روشنی میں یہ غلط ہے۔ عباراتِ ماسبق سے اتنا واضح ہو ہی چکا ہے کہ میرؔ نادر شاہی حملے کے بعد دوبارہ دہلی آئے تھے اور وہ زمانہ اگر ۱۷۴۰ء کا بھی مانا جائے تو سورج مل کی بغاوت جولائی ۱۷۶۲ء کا واقعہ ہے جس کی رو سے ۲۳۲۲ برس کے بعد آگرہ گئے ہیں نہ کہ تیس برس میں۔''

بہر حال جب عرصۂ طویل کے بعد وہ اپنے وطن آگرہ پہنچے تو سب سے پہلے اپنے والد اور چچا کے مزاروں پر گئے۔ اس بار وہ اپنے وطن تقریباً چار ماہ رہے یعنی جولائی ۱۷۶۲ء سے لیکر اکتوبر ۱۷۶۲ء تک۔ لیکن اس بار ان کا جی آگرے میں نہ لگا۔ ''آہ اے وطن'' کے عنوان سے وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں :

''صبح وشام دریا کے کنارے سیر وتماشا کرنے جاتا تھا۔ دو تین بار سارے شہر میں گھوما۔ وہاں کے عالموں، فقیروں اور شاعروں سے ملا مگر کوئی ایسی بات کرنے کی گھر کا نہ ملا جس سے دلِ بیتاب تسلّی ہوتا۔ میں نے سوچا سبحان اللہ یہ وہی شہر ہے جس کی گلی میں عارف، کامل، فاضل، شاعر، منشی ۔۔۔۔۔۔ آج کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی جہاں بیٹھ کر دل خوش کرلوں! ایسا آدمی نہیں ملتا جس سے کچھ دیر گپ کرسکوں بس ایک وحشتناک خرابہ تھا جسے دیکھ کر بہت رنج اٹھایا اور واپس آگیا۔ اس طرح چار مہینے وطن مالوف میں گزارتے رخصت ہوتے وقت آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔''

جمیل جالبی نے لکھا ہے۔ اس بار یہاں آکر میرؔ خوش نہیں ہوئے کہ کوئی ایسا مخاطب نہ ملا جس سے بات کر کے دلِ بیتاب کو تسلی ہوتی۔

عملی طور پر میرؔ کی گوشہ نشینی، نفاست پسندی اور زود رنجی نے ہمیشہ انھیں عوام سے الگ تھلگ ہی رکھا حالانکہ فکری طور پر ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ ؎

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

ورنہ ایسا نہ تھا کہ آگرہ شعراء وعلماء سے خالی ہوگیا تھا۔ نظیر اکبرآبادی جن کا سنِ پیدائش ۳۵-۱۷۳۲ء کے درمیان مانا جاتا ہے ۱۷۶۲ء تک ان کی عمر پچیس تیس برس کی ہوچکی تھی اور پہلے

اپنی غزلیہ شاعری اس کے بعد مخصوص قسم کی نظمیہ شاعری کے ذریعہ اپنی پہچان بنا رہے تھے۔ شیفتہ کے تذکرے 'گلشنِ بیخار' کے جواب میں لکھے گئے تذکرہ 'گلستانِ بے خزاں' میں اور زندگانی بے نظیر کے مصنف سید محمد عبدالغفور شہباز کے یہاں بھی میر اور نظیر کی ملاقات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ گلستانِ بے خزاں چونکہ جوابی کارروائی کے طور پر لکھا گیا تذکرہ ہے اس لئے تحقیق کی رو سے زیادہ معتبر نہیں لیکن زندگانی بے نظیر خاصی محنتوں اور تحقیقی کاوشوں کے بعد لکھی گئی کتاب ہے۔ اس میں اس ملاقات کا ذکر یوں ملتا ہے :

> ''نظیر اپنا استاد آپ تھا۔ ہر چند تھوڑی بہت تقلید سے تو چارہ نہ تھا مگر طبیعت کی آزادی اور شوخی زیادہ تر اپنی طرف کھینچ کر لے جاتی تھی۔ جس سے قوتِ ایجاد کو پھولنے پھلنے کا اچھا موقع ہاتھ آتا تھا۔ اسی عالم میں اس نے ایک شگفتہ اور لطیف غزل تیار کی ۔امتحاناً کسی دلی دوست کو سنائی تو وہ مصر ہوئے کہ اس کو اب کے مشاعرہ میں پڑھو اور ضرور پڑھو تقریب کا میرا ذمہ۔ نظیر اس دوست کی اصلاح سے پہلے انکسار سے نہیں مانتا مگر خودنمائی دامن نہیں چھوڑتی۔ آخر جاتا ہے۔ نظیر کو آئے ہوئے اتنا زمانہ ہو گیا تھا کہ کسی طرح میر صاحب تک بھی اس کا تذکرہ پہنچ گیا تھا۔ جب اس کی غزل کی تقریب کی گئی میر صاحب نے اپنے مقدس لبوں سے اظہارِ تبسم فرما کر ایک مربیانہ انداز سے یوں ارشاد کیا۔ ہاں بھئی پڑھو اور ضرور پڑھو۔''

دل کی دھکڑ پکڑ اس وقت قابلِ ملاحظہ تھی مگر تقریب ہو چکی تھی۔ اتنا بڑا استاد شوق ظاہر کر چکا تھا پھر سوا پڑھنے کے چارہ کیا تھا۔ دل کڑا کر کے بند سے غزل کھولی اور ورق کو مضبوطی سے تھام کر ایک نیم مجوب ادا سے لوگوں کی طرف مخاطب ہوا۔ چاروں طرف سے ارشاد ارشاد کا غل تھا

جس وقت نظیر نے یہ مطلع پڑھا ہے لوگوں کا عجب عالم تھا ۔

نظر پڑا اک بُت پری وش نرالی سج دھج نئی ادا کا
جو عمر دیکھو تو دس برس کی پہ قہر آفت غضب خدا کا

ختم غزل پر میر صاحب نے قریب بلا کر پیٹھ ٹھونکی اور مکرر فرمایا عمرت دراز باد۔

اس واقعہ سے نظیر کو خاصی شہرت ملی ۔ کچھ اس رنگ کی غزلیں بھی کہیں اور اسی طرح لڑکوں سے عشق بھی کئے لیکن طبیعت کا میلان کچھ ایسا تھا کہ جلد ہی غزل سے نظم کی طرف آ گئے اور پھر اس کے ہو رہے اور اسی میں اپنی غیر معمولی پہچان بنائی۔

میر کی آگرے سے بیزاری دراصل زندگی سے بیزاری ہے اور وہ پریشان ہے جسے وہ زندگی بھر برداشت کرتے رہے اور در بدر ٹھوکریں کھاتے رہے ۔ اسی در بدری سے تنگ آ کر ۱۷۷۲ء سے تقریباً گوشہ نشین ہو گئے ۔ اہلِ ہنر دہلی چھوڑ رہے تھے سودا اور سوز لکھنؤ جا چکے تھے۔ ۱۷۷۱ء میں سودا کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ نے انھیں لکھنؤ بلوا لیا جہاں وہ تقریباً تیس سال رہے اور وہیں ۱۸۱۰ء میں وفات پائی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ میر نے اپنی زندگی کا سب سے کم وقفہ اپنے وطن میں گزارا۔ لیکن گھر کے صوفیانہ ماحول اور چچا، والد کی کیفیت اور نصیحت زندگی بھر ان کے اعصاب پر سوار رہی بقول آل احمد سرور : ''وہ اعصاب زدہ تھے جس سے زندگی بھر میر پیچھا نہیں چھڑا سکے۔''

سب جانتے ہیں کہ میر کی شاعری کا سب سے بڑا مرکز و محور عشق ہے لیکن یہ عشق سفلی اور طفلی نہیں ہے۔ والد نے حیات و کائنات سے عشق کرنے کا ہنر سکھایا اور یہی وہ زاویہ ہے جس سے میر نے زندگی، انسان، معاشرہ اور فرد کے رشتوں کا سراغ لگایا اور یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جو پھیل کر ایک دائرے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جو غزل کے دائرے سے نکل کر مثنویوں میں بھی ڈھل جاتا ہے۔ شعلۂ عشق، دریائے عشق وغیرہ مثنویاں اپنی انھیں خصوصیات کی وجہ سے شہرت رکھتی ہیں۔

اردو شاعری کیفیاتِ عشق و عاشقی اور وارداتِ قلبی سے بھری پڑی ہے لیکن میرؔ کا سا عشق کوئی نہ کر سکا حالانکہ میرؔ اسے بھاری پتھر کہتے رہے اور اپنے کاندھوں کو ناتواں بتاتے رہے لیکن میرؔ نے ہی اس بھاری پتھر کا بوجھ جس انداز سے اٹھایا کوئی اور نہ اٹھا سکا۔ یہ سب کچھ آگرے کی دین ہے یہی نہیں میرؔ کا غم بھی آگرے کا ہے۔ فکرِ معاش بھی آگرے کی ہے۔

فکر، غم، عشق اور سلیقہ کہ انھیں چاروں ستونوں پر میرؔ کی شخصیت اور شاعری کی عمارت کھڑی ہے۔ ان سب کی بنیاد آگرے میں پڑی۔ پھر تو اس کے بام و در ایسے چمکے اور دمکے کہ میرؔ کی شاعری کا سورج کبھی غروب نہ ہو سکا کہ غالبؔ جیسے منفرد اور عظیم شاعر نے بھی انھیں استادِ سخن تسلیم کیا اور خود میرؔ کہہ اٹھے۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

میرؔ کا معیارِ عشق

(غزل کے حوالے سے)

ایک وقت تھا کہ تحریک آزادی کا انقلاب پرور دور میرؔ شناسی کی قدر و قیمت کا تعین نہ کر سکا۔ ترقی پسند حلقوں اور جدّت پرست طبقوں میں میرؔ مایوسیوں کے شاعر سمجھے گئے۔ ان کی شاعری کو بیمار ذہن کی پیداوار کہا گیا۔ بڑے بڑے نابغۂ روزگار غالبؔ اور اقبالؔ کی طرف متوجہ ہو رہے تھے مگر جلد ہی میرؔ شناسی کا احساس بڑھنے لگا۔ نئی نسل مُڑ مُڑ کر میرؔ کی طرف دیکھنے لگی۔ اُن کی شاعری میں ترقی پسندی کے عناصر بھی تلاش کئے جانے لگے، سماجی شعور کی واضح جھلک بھی دیکھی جانے لگی اور انہیں خدائے سخن بھی تسلیم کیا گیا۔ اِس میں شک نہیں کہ غم کی مختلف قسموں نے میرؔ کو میرؔ بنا دیا۔ آنکھوں کی راہ سے بہتے ہوئے خونِ دل نے ان کی غزل کو گہرا رنگ عطا کیا۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں نے اُن کے اشعار کو آبدار بنایا۔ مصائب کی بھٹی میں تپ کر اُن کی شاعری کندن بنی۔ خانگی حالات سے تنگ آ کر میرؔ کو اکبرآباد چھوڑنا پڑا۔ یہ وہی اکبرآباد تھا جہاں ان کے دِل کی دنیا لٹی تھی اور رشتہ داروں کے ہاتھوں انہیں تکلیف پہنچی تھی۔ اکبرآباد وہ جگہ تھی جہاں ان کا دِل کسی خارزار سے ایسا الجھا کہ لہولہان ہو کر آنکھوں کی راہ سے بہہ نکلا میرؔ کہتے ہیں۔

بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہہ نکلا
رہا جو سینۂ سوزاں میں داغ دار رہا

صفدر آہ نے میرؔ کے اکبرآباد کے اُس عشق کو فرضی بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''تذکرۂ بہارِ بے خزاں کے حوالے سے عبدالباری آسیؔ، مجنوں گورکھپوری اور خواجہ احمد فاروقی نے ہمیں میرؔ کی ایک داستانِ عشق سنائی۔''

'بہارِ بے خزاں' کے بارے میں صفدر آہ نے لکھا کہ:

''یہ ایک قلمی تذکرہ ہے جو اپنے پست معیار کی وجہ سے قابلِ اشاعت نہیں سمجھا جاتا۔''

ڈاکٹر نفیس بانو، ریڈر، شعبۂ اردو، وسنتا کالج، بنارس

صفدر آہ میرؔ کے معاشقے کی نسبت لکھتے ہیں کہ:

''میر شاعر تھے عاشق مزاج تھے۔ آگے چل کر ان کے جو معاشقے ہوئے ہیں ان میں سے بعض کی نشان دہی بھی ان کے کلام میں ہے۔ لیکن میرؔ کے کسی شعر کا اکبرآباد کے فرضی عشق سے کوئی تعلق نہ ہے نہ ہوسکتا ہے''[1]

میرؔ جب اکبرآباد سے دلّی آئے تھے، اُس وقت اُن کی عمر سولہ، سترہ سال تھی۔ اس عمر کے عشق کو صفدر آہ نے بچکانے کھیل سے تعبیر کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس زمانے میں یہ سن آج کی بہ نسبت زیادہ باشعور ہوتا تھا۔ اس عمر میں لڑکوں کی شادیاں ہو جایا کرتی تھیں۔ غالبؔ میرؔ کے بعد کے شاعر ہیں۔ حالیؔ غالبؔ کے شاگرد ہیں۔ اُن لوگوں کی کم عمری میں شادیاں ہوگئی تھیں۔ صفدر آہ نے لکھا ہے کہ میرؔ نے ۶۳ سال کی عمر میں لکھنؤ میں دوسری شادی کی۔ بڑھاپے کی سرحد میں قدم رکھنے کے بعد جب وہ شادی کر سکتے ہیں تو لا اُبالی عمر میں اُن کا کسی زُلف گرہ گیر کا اسیر ہو جانا بعید از قیاس بھی نہیں۔ ہمیں اِس سے بحث نہیں کہ میرؔ کا دل اکبرآباد میں گیا یا دہلی میں۔

'جی کا جانا ٹھہر گیا صبح گیا یا شام گیا'

بہر حال دِل کے جانے کا غم معمولی غم نہ تھا کہ وہ اُسے بُھول جاتے۔ یہ وہ غم تھا جو تا عمر اُن کے سینے میں کچوکے لگاتا رہا۔ میرؔ حوادثِ روزگار سے شاید اس قدر دل برداشتہ نہ ہوتے اگر ان کے دل کی بستی نہ اُجڑتی۔ اس بستی کے اُجڑنے کا غم اُن کے تمام غموں پر حاوی ہے۔ میرؔ نے بارہا اس طرف اشارے کیے ہیں۔

عشق کی آگ میرؔ کی غزلوں میں کسی نہ کسی صورت موجود ہے۔ کبھی چراغ کی طرح اُن کا دل جلتا رہتا ہے۔ کبھی عشق کی تپش ان کے وجود کو جھلسا دیتی ہے۔ کبھی یادوں کی آنچ اُن کے سینے کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔

میرؔ آ کے ایک دن وہ سینے سے لگ گیا تھا
تب سے ہماری چھاتی ہر شب جلا کرے ہے

اس میں شک نہیں کہ میرؔ کے جذبۂ عشق کی صداقت نے ان کی شاعری کو جلا بخشی اور

انسانی فطرت کے عین مطابق بنایا۔ اُن کے اشعار جذبات انسانی کی تفسیر ہیں، ان کی غزلوں میں ہمیں اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔ میرؔ کی غزلوں میں جو دردمندی، سوز و گداز، خلش، چبھن اور تڑپ ہے۔ اُنہیں دیکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ یہ محض شاعر کا تخیل ہے یا حقیقی تجربات ہیں۔ بلاشبہ شاعر اپنے تخیل سے کام لے کر ایسے تجربات کے بیان پر قادر ہوتا ہے جس کا اس کی ذاتی زندگی سے دُور کا واسطہ نہیں ہوتا، مجنوںؔ گورکھپوری نے ایک جگہ کہا تھا:

''شاعر تخیل کا مرید ہوتا ہے اور تخیل تجربے کا محتاج نہیں ہوتا''[۲]

میرؔ کی غزلیں زبانِ حال سے کہتی ہیں کہ یہاں محض تخیل کی رنگ آمیزی نہیں بلکہ حقیقی زندگی کے تلخ تجربات، تلخ حقائق اور خونِ دل کی گل کاریاں بھی ہیں۔ ان کے ایوانِ غزل کی تعمیر انہیں عناصر سے ہوئی ہے۔ عشق کا جذبۂ صادق اُن کے آنسو کو گوہر تاب دار بنا گیا، دل پر گزری ہوئی کیفیات الفاظ کے سانچے میں ڈھل گئیں۔

دل کی لاگ بری ہوتی ہے، رہ نہ سکے ٹک جائے بھی
آئے بیٹھے، اٹھ بھی گئے، بیتاب ہوئے پھر آئے بھی

میرؔ کے اشعار میں دلوں کی دھڑکنیں سنائی پڑتی ہیں۔ ان کی شاعری جگر سوزی کی شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بلا کی تاثیر ہے۔ ان کے اشعار دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں اور رُوح کی پنہائیوں میں سما جاتے ہیں۔ میرؔ کا عشق انسانی جذبات کا ترجمان ہے۔ احساسات و کیفیات کی گہرائی اُن کے عشق میں نظر آتی ہیں۔ میرؔ اپنے سینے میں درد کی کسک چھپائے ہوئے جیتے ہیں۔ مسائل حیات کے پیچ و خم میں اُلجھ کر اپنے دِل کے زیاں کو کبھی دانستہ کبھی نادانستہ نظر انداز بھی کرتے ہیں۔ لیکن پھر کسی وقت 'چشم خوں بستہ سے' لہو ٹپک پڑتا ہے اور جب کسی کا نام لیتے ہیں تب چشم بھر آتی ہے۔ پُرانی یادیں پھر اُبھر کر خون کے آنسو رُلا دیتی ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں۔

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم تو سمجھے تھے کہ اے میرؔ یہ آزار گیا

یہ شعر زندگی کی حقیقتوں سے بھرپور ہے۔ اصحابِ کہف کی نیند سونے والے انسانی زندگی کے بہت سے غم جب بیدار ہوتے ہیں تو انسان ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ سوزِ دروں کی

مدت سے ہر دم ان کی چھاتی جلا کرتی ہے ۔

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے
اِک آگ سی رہے ہے، کیا جانئے کہ کیا ہے

اس شعر میں میرؔ کیا جانیے کہ کیا ہے، کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والا اس کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے ۔ میرؔ کے اس استفہامیہ لہجے اور لفظوں کی ایمائیت سے شعر کی معنویت اور جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ کیفیتِ عشق کی اس سے بہتر ترجمانی نہیں ہو سکتی ۔ شیفتہ نے میرؔ کے خیال سے استفادہ کیا ہے ۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہؔ
اِک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

میرؔ کی شاعری جگر سوزی کی شاعری ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بلا کی تاثیر ہے ۔ ان کے اشعار دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں اور رُوح کی پنہائیوں میں سما جاتے ہیں ۔ ان کی شاعری میں بہت سی جگہ عشق ان کے نزدیک تعیش پسندی اور ہوس پرستی کا نام نہیں، بلکہ پرستش کا نام ہے ۔ ان کا تصورِ عشق حسن کی پرستش کو دل کا ایمان سمجھتا ہے ۔ ان کے عشق کا معیار نہایت بلند نظر آتا ہے ۔ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا عشق بازاری نہیں جو بازار سے جا کر 'دل و جاں اور' لے آنے کی تمنا کرے ۔ ان کی نگہِ عاشقی خوب سے خوب تر کی تلاش میں بھٹکتی نہیں بلکہ ان کے یہاں ایک مستقل مزاجی کی شان نمایاں ہے ۔ وہ عشق میں ثابت قدم نظر آتے ہیں ۔ بوالہوسی ان کا شعار نہیں ۔

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشان نظری کا

مدت سے چشم بستہ بیٹھا رہا ہوں لیکن وہ روئے خوب ہرگز جاتا نہیں نظر سے

عام خیال ہے کہ میرؔ کا کلام یاس و غم کی تصویر ہے ۔ میر ہر وقت روتے بسورتے رہتے ہیں ۔ میرؔ کے یہاں حزنیہ پہلو ہی ہمیں دکھائی دیا نشاطیہ پہلو کو ہم نے دیکھنا ہی نہ چاہا لہٰذا وہ پہلو ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا ۔ میرؔ کے یہاں زندگی کی تڑپ ہے ۔ زندگی میں دل کی اہمیت

کا احساس ہے۔ ان کے یہاں فراریت قنوطیت اور حرماں نصیبی کی جھلکیاں جا بجا ہیں۔ لیکن انہیں محض فراریت اور قنوطیت کا شاعر کہہ دینا درست نہیں۔ فراقؔ میرؔ کی شاعری کو پامردی کی شاعری کہتے ہیں۔ مجنوںؔ گورکھپوری بھی فراقؔ کے ہم خیال ہیں۔ مجنوںؔ، میرؔ کو قنوطی شاعر اور شکست خوردہ و یاس پرست نہ مانتے ہوئے انہیں جری انسان تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں میرؔ جرأتِ رندانہ نہیں، بلکہ جرأت مردانہ، کے ساتھ زندگی کی سخت سے سخت آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کی ہمیں ترغیب دیتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ میرؔ نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ انہیں اپنی انا کی بقا کا ہمیشہ احساس رہا۔ سخت سے سخت آزمائش کی گھڑیوں میں بھی ان کا سر اونچا رہا۔ معاملاتِ عشق میں بھی وہ اپنی خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، یہی وجہ ہے کہ کہیں عشق کے وقار کو ٹھیس نہ پہنچے اور ناموسِ عشق پر آنچ نہ آئے، وہ تمام عمر ناکامیوں سے کام لے کر اپنی محبت کو سلیقے سے نبھاتے ہیں ؎

اس مہ سے دل کی لاگ وہی متصل رہی
گو چرخ نے بصورتِ ظاہر جدا رکھا

میرؔ کے تصورِ عشق میں خودداری کو بہت دخل ہے عشق اور خودداری ایک ساتھ ذرا مشکل سے ہی چل پاتے ہیں۔ عاشق پندارِ خودی کے آبگینے کو بچا بچا کر رکھتا ہے لیکن ایک مقام آتا ہے کہ یہ آبگینہ چور چور ہو جاتا ہے اور اس کی زبان سے بے ساختہ نکلتا ہے

ایک پندارِ خودی جس کو بچا رکھا تھا
آج ہم وہ بھی تری بزم میں ہار آئے ہیں

غالبؔ پندار کا صنم کدہ ویران کر کے کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل چلے جاتے ہیں خواہ انھیں بے غیرت ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ وہ اس ذلّت کو سہہ لیتے ہیں اور محبوب کے در سے اُٹھنے کا نام نہیں لیتے ؎

اس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اِس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

لیکن میرؔ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انہیں غیرت سے مر جانا گوارا ہے مگر محبوب کے در پر دوبارہ جانا گوارا نہیں اور یہ ضبطِ عشق بھی بڑے دل و جگر کی

بات ہے ۔

کیا کہیں اُس نے جو پھیرا اپنے در سے ہمیں
مر گئے غیرت سے ہم بھی پر نہ اُس کے گھر گئے

مندرجہ بالا مثالوں کی روشنی میں عشق ان کے نزدیک تعیش پسندی اور ہوس پرستی کا نام نہیں، بلکہ پرستش کا نام ہے۔ ان کا تصور عشق حسن کی پرستش کو دل کا ایمان سمجھتا ہے۔ ان کے عشق کا معیار نہایت بلند ہے۔ ان کا عشق بازاری نہیں جو بازار سے جا کر دل و جاں اور لے آنے کی تمنا کرے۔

میرؔ کے بارے میں یہ آرا تو عام ہے کہ ان کا کلام پست مزید پست ہے اور بلند مزید بلند۔ ان کے یہاں عشق میں متضاد رویے بھی ملتے ہیں۔ شدتِ کرب میں کبھی کبھی انسان خود بھی اپنے آنسوؤں کا مطلب نہیں سمجھ پاتا۔ مایوسیوں اور ناامیدیوں کی اتھاہ گہرائیوں سے آنسو اُمڈے چلے آتے ہیں اور آنکھوں کی جھیل میں آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ میرؔ عشق کا پاس رکھنے کے لئے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے پیمانے کو چھلکنے نہیں دیتے۔ تو دوسری جانب محبوب کے سامنے اپنے آنسوؤں کو ظاہر بھی کر دینا چاہتے ہیں۔ مشہور شعر ہے ۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

ایک دوسرا شعر جس میں متضاد پہلو اس طرح ابھرتا ہے ۔

مژگانِ تر کو یار کے چہرے پہ کھول میرؔ
اس آبِ خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

میرؔ کے لہجے کی برجستگی، خود کلامی اور فطری کیفیات کی فطری ادائیگی ان کی غزلوں کا خوبصورت زیور ہیں۔

میرؔ نفسیاتِ عشق کے رمز شناس ہیں۔ محبوب سے کہنے کو بہت سی باتیں ہیں لیکن سامنے آجانے پر کتنی باتیں دل کی دل میں رہ جاتی ہیں ۔

کہتے ہو کہ یوں کہتے یوں کہتے جو آجاتا
سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس خیال سے غالبؔ نے اس طرح خوشہ چینی کی ہے ۔

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

بلاشبہ غالبؔ کے لفظ 'کیا' میں معنویت اور رمزیت پنہاں ہے مگر میرؔ کے اشعار میں لہجے کی سادگی اور ڈرامائی انداز سے دل کی فطری کیفیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ پہلے تکرار سے شوق کی لامتناہی آرزوؤں کا احساس ہوتا ہے۔ اور ان کی یہی آواز کائنات کی آواز بن کر آفاقیت کی منزل کو چھو لیتی ہے۔ فراقؔ نے اپنے مضمون ''فانی بدایونی'' میں ایک جگہ کہا تھا:

''بڑی شاعری میں شاعر کی آواز سنائی دیتی ہے، سنسار کا سنگیت سنائی دیتا ہے۔ وہی صاحب طرز بڑا شاعر ہے۔ جس کا طرز طرزِ کائنات ہے''

آنے والی نسلیں میرؔ سے اثر قبول کرتی آئی ہے۔ میرؔ کی عظمت کا اعتراف کل بھی کیا گیا اور آج بھی ۔

غالبؔ اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

حسرتؔ نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا ۔

میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

ہر عہد میں بعض بعض شعراء نے ان کی زمین اور اُن کے اسلوب کو شوقیہ اپنانے کی کوشش کی ہے ۔ اس عہد میں کلیم عاجزؔ کے حزنیہ لہجے میں میر کا اثر ہے۔ کرے ہے، آئے ہے، جائے ہے، کہو ہو، سنو ہو جیسی میرؔ کی ردیف انھوں نے خوب اپنائی ہے:

تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

فراقؔ کے ''گل نغمہ'' میں چار طویل غزلیں شامل ہیں جس پر انھوں نے ''طرز میر'' کا عنوان دیا ہے ۔

اب ہے فراق کا کچھ روزوں سے جو عالم کیا پوچھو ہو
ہم اشکوں میں کائنات کے نوکِ قلم کو ڈبو لیں ہیں

میرؔ کہتے ہیں ۔

اس کا غضب سے نالہ نہ لکھنا تو سہل ہے
لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

آج کا شاعر کہتا ہے ۔

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

(احمد فراز)

میرؔ کا شعر ہے

ایک نگہ، ایک چشمک، ایک سخن
اس میں بھی تم کو ہے تامل سا

میرؔ کی لے کی بازگشت آج اس طرح سنائی دیتی ہے ۔

اک کرن تبسم کی زادِ راہ بن جاتی
اور دل نے کیا مانگا اور ہم نے کیا چاہا

(ادا جعفری)

میرؔ نے کہا ۔

چھپ لُک کے بام و در سے گلی کوچے میں سے میرؔ
میں دیکھ لوں ہوں یار کو اک بار ہر طرح

یہی خیال مجازؔ کے یہاں اس طرح ہے ۔

اس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے
جہاں سے چاہتا ہوں تم کو دیکھتا ہوں میں

میرؔ کا ایک شعر ہے ۔

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا ان اچھی آنکھوں والوں کا

جاں نثار اختر کا مشہور شعر ہے ۔

ہم سے بھاگا نہ کرو دور غزالوں کی طرح
ہم نے چاہا ہے تمھیں چاہنے والوں کی طرح

میرؔ کے بارے میں یہ آرا تو عام ہے کہ ان کا کلام پست مزید پست ہے اور بلند مزید بلند ہے۔ اُن کے کلام کا وہ حصہ جو جنسی جذبہ اور معاملہ بندی سے متعلق ہے اس قبیل کے اشعار کو شمس الرحمٰن فاروقی ''انسانی تعلقات کی شاعری'' سے تعبیر کرتے ہیں کہتے ہیں:

''روزمرہ کی زندگی سے ان کا رشتہ مضبوط ہے، وہ اس دنیا کے ہیں، لیکن اس میں قید نہیں ہیں۔ اسی کی بنا پر وہ انسانی رشتوں کے تعلق سے ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں''[۳]

آگے فاروقی صاحب کہتے ہیں:

''.....روزمرہ زندگی کے حوالے سے بات کہنے کا انداز ہے جو اس میدان میں میرؔ کا خاصہ ہے''[۴]

میر کے یہاں عشق میں جنسی جذبہ سے مغلوب ہوکر عالمِ سرشاری اور سرمستی کی کیفیت میں کہے گئے اشعار سے فاروقی صاحب نے بہت سی مثالیں دی ہیں۔

بوسہ اس بت کالے کے منہ موڑا بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا

چولی جہاں سے مسکی، پھر آنکھیں وہیں چپکیں
جب پیرہنِ گل بھی اس خوبی سے چس جاوے

کھینچا بغل میں، میں جو اُسے مست پا کے رات
کہنے لگا کہ آپ کو بھی اب نشا ہوا

یہ مثالیں اس بات کی غماز ہیں کہ میر کا عشق محض رونے بسورنے والا اور ہجر کا مارا نہیں ہے۔ بدن کی لطافت اور یاقوتی لب کا ذکر ان کے یہاں بار بار آتا ہے۔ بوسہ کنجِ لب کا ذائقہ تو وہ بھولتے ہی نہیں۔ فراقؔ لکھتے ہیں:

''.....بنیادی طور پر یا مرکزی طور پر تو اس کا (عشق کا) مخزن یا

تعلق جنسیات یا شہوانیت میں ملے گا اور یہاں سے اُبھر کر
جذبات اور نفسیات کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا تمام قوائے انسانی اور تمام
شخصیت میں یہ احساس یا یہ غیبی تحریک بھر جاتی ہے اور شش جہت سے
انسان پر چھا جاتی ہے۔'' ۵

میرؔ کی شاعری میں نہ صرف احساس بلکہ شدتِ احساس 'شش جہت' سے عکس ریز ہے۔ تصویر کے دونوں رخ میرؔ کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ میرؔ کے یہاں معاملہ بندی اور جنسی رویوں کی شاعری ان کے اس معیارِ عشق پر ضرب کاری کرتی ہے جس کے لیے میرؔ مشہور ہیں۔ مثلاً

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

یا

ساعدِ سیمیں اس کے دونوں ہاتھوں میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم ہائے خیال خام کیا

یا یہ صورت ہے یا وہ صورت کہ جب اور جہاں انھیں موقع ملا وہ کھل کھیلنے سے باز نہیں آتے۔

کلیم الدین میرؔ پر اپنی سخت تنقید کرتے ہوئے یہ کہنے سے باز نہ آئے کہ!

''.....اپنے حدود کے اندر میرؔ لاجواب ہیں۔ چند چیزیں جو صرف انھیں کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں اور اس لحاظ سے وہ یگانہ و یکتا ہیں'' ۶

آزردہ کے حوالے سے کہ ان کا کلام جو بلند ہے وہ بہت بلند اور جو پست ہے وہ بہت پست کا ذکر کرتے ہوئے کلیم الدین محسوس کرتے ہیں اور محسوس کراتے ہیں کہ دو میرؔ ہیں، ایک وہ میرؔ جس کی اثر انگیزی دل کے تاروں کو جھنجھنا دیتی ہے۔ دوسرا فارسی کے زیر اثر وہ میرؔ ہے جو انسانی تعلقات کی انتہائی کھلی ہوئی تصویر دکھانے سے باز نہیں آتا۔

بہر حال زندگی میں بہت اُتار چڑھاؤ ہیں احساسات کی مختلف قسمیں ہیں جذبات کی مختلف پرتیں ہیں، میرؔ کے یہاں یہ تہیں اور یہ پرتیں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اُن کی روشنی میں ان کے تصورِ عشق کو سمجھنا ہوگا ان کا عشق نہ محض معیاری ہے اور نہ محض بازاری۔ دونوں کی جھلکیاں

موقع بہ موقع دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بشیر بدرؔ کا شعر یاد آتا ہے۔

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

بہت سے مقامات پر میرؔ کے یہاں یہ حجاب اٹھتا ہوا صاف دکھائی دیتا ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین لکھتے ہیں:

''.....شکستہ رنگ، زرد رو اور خمیدہ قالب میرؔ صاحب کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو بھی پسِ منظر میں ابھرنے لگتا ہے۔ ان اشعار میں وہ کبھی تو محبوب کے بند قبا وا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، کبھی مستی کے عالم میں محبوب سے ہم آغوش ہیں اور کبھی پسینے میں بھیگے ہوئے محبوب کے رنگِ بدن سے سرشار ہیں۔''

آگے پروفیسر حسین لکھتے ہیں:

''.....جنسی جذبے یا جسمانی آلودگی کو حقارت سے دیکھنے یا اسی پر اکتفا کرنے کے بجائے میرؔ نے اس جذبے سے وابستہ احساسِ جمال کی پیچیدہ صورت حال کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔''[۷]

بلاشبہ میرؔ ایک بڑے شاعر تھے۔ انسانی کیفیات و احساسات کے نازک اور اہم موڑ کا انھیں بھرپور ادراک تھا۔ میرؔ کی شاعری میں مروجہ مذاقِ سخن تراوش نہیں کرتا بلکہ میرؔ جس عہد میں سانس لے رہے تھے وہ عہد اُن کے کلام میں بخوبی نظر آتا ہے۔ شعر و ادب اپنے عہد کی فضاؤں میں نشو و نما پاتا ہے۔ میرؔ کی غزلوں میں ایک طرف عشق کا وہ معیار ہے جہاں 'غبارِ میرؔ' محض دور بیٹھا ہے تو دوسری طرف اُن کے یہاں وہ عشق بھی ہے جسے محبوب کا وصل بھی حاصل ہے، جو بوس و کنار سے لذت حاصل کرتا ہے۔ میرؔ نے بارہا دل کا خون کیا ہے۔ 'دلِ پرخوں کی گلابی' سے وہ عمر بھر شرابی رہے۔ اس کے باوجود ان کے یہاں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں بوالہوسی کا رنگ بھی ہے۔:

حسن اک چیز ہے، ہو دین، کہ تو ہو ناصح
ایسی شئے سے کوئی بھی ہاتھ اٹھاتا ہے میاں

اور عشق میں آسودگی کا یہ حال ہے کہ ؎

آگے ایسا نکھرا نکھرا کا ہے کو میں پھرتا تھا
جب سے آنکھ لگی اس مہ سے، چہرا مرا مہتابی ہے

خود اعتمادی بھی غضب کی ہے ؎

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میرؔ
دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

غرض ایک طرف محبوب پردہ نشیں ہے، دوسری طرف ان کے یہاں بازاری محبوب کی بھی نمایاں جھلک دکھائی دیتی ہے اور محبوب کے مجلس نشینوں سے یہ بھی سنا جاتا ہے کہ وہ کمینوں کی صحبت میں دارو بھی پیتا ہے۔ جسے کوچۂ جاناں والے 'ابے' کہہ کر پکارتے ہیں:

یوں پکارے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے
ادھر آ ابے او چاک گریباں والے
کہ دارو پیئے ہے رات کو مل کر کمینوں سے

ہر ادنیٰ و اعلیٰ شاعروں کے یہاں کچھ خیالات معمولی بھی ہوتے ہیں اور کچھ بلند بھی۔ میر کے یہاں اگر کچھ خیالات معمولی بھی ہیں تو ان کے کلام کی عظمت پر آنچ نہیں آتی۔ ان کی تمام شاعری کو معمولی شاعری کے خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ میرؔ کے وہ اشعار جن میں طفل، عطار اور برہمن کا ذکر ہے اس پر بھی بہت اعتراض ہوا۔ مثلاً ان جیسے عظیم شاعر کی زبان پر ایسے الفاظ آئے ہی کیوں۔ یا یہ کہ میرؔ کے یہاں جہاں عشق کا معیار بہت ارفع و اعلیٰ ہے وہاں ایسے اشعار کہہ کر میرؔ نے اپنی بد مذاقی کا ثبوت ہی کیوں دیا وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ شعر و ادب ہوا میں پروان نہیں چڑھتا۔ میرؔ نے ایسے اشعار کہہ کر اپنی بد مذاقی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اپنے عہد کی اخلاقی اقدار کی عکاسی کی ہے۔ میر اپنے عہد کے خوں چکاں سیاسی حالات پر بھی نظر رکھتے ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کی دنیا عشق کے اردگرد گھومتی ہے۔ وہ عشق جو حرارت بخش بھی ہے۔ انھیں دو انتہاؤں پر میرؔ کے کلام کا انحصار ہے۔

حواشی:

۱۔ صفدر آہ.....میر اور میریات

۲۔ مجنوں گورکھپوری.....غزل سرا، ص۔۱۲

۳،۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی..... شعر شور انگیز، جلد اول، ص۔۱۱۳، ۱۲۵

۵۔ فراق گورکھپوری.....گل نغمہ ،ص۔۱۱۰تا۱۱۶

۶۔ کلیم الدین.....اردو شاعری پر ایک نظر ،ص۔۱۳۱

۷۔ علی گڑھ میگزین.....انتخاب نمبر، ۷۶، ۱۹۷۵ء ص۔۱۷۳

کلامِ میرؔ۔ایک نفسیاتی جھلک

میر تقی میرؔ اردو کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری بے شمار اَن دیکھے جزیرے اپنے اندر رکھتی ہے۔ میرؔ کبھی شاعر بن کر، کبھی حریف بن کر، کبھی سیاح بن کر اور کبھی ایک عام انسان بن کر ان جزیروں کی سیر کراتے ہیں خود سیر کرتے ہیں۔ ان دیکھے جزیروں کو کھوجتے ہیں، دوسروں کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا یہ سفر ہمیں ''نئے میرؔ'' سے متعارف کراتا ہے۔ ایک ایسے میرؔ سے جو سفرِ زیست کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا، رنگا رنگ تجربے حاصل کرتا ہوا اور طرح طرح کے معرکوں سے دوچار ہوتا ہے۔ میرؔ آنکھ بند کر کے راہ سے نہیں گزرتے بلکہ زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں، پرکھتے ہیں، پھر برتتے ہیں۔ میرؔ ان تمام کیفیات اور تجربوں کی گہرائی لئے ہوئے نازک اور لطیف جذبوں کی تہہ در تہہ پرتیں کھولتے ہیں تو سادہ و عام فہم انداز کا سحر دل کو چھوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ میرؔ نے اپنی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کو کام میں لا کر شاعری میں اس طرح سمویا کہ آگے آنے والے زمانے تک اس کی گونج سنائی دیتی رہے گی۔ میرؔ نے اپنی اس خوبی کا اعتراف خود کیا ہے جو غلط معلوم نہیں ہوتا۔

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

شاعری ہر زمانے میں اپنا رنگ بدلتی ہے مگر میرؔ کی انفرادیت اسی طرح قائم رہی۔ میرؔ میرؔ نہ ہو کر ایک الگ شخصیت، ایک الگ پہچان لے کر سامنے آئے۔ ان کی شخصیت جب تخلیقی عمل سے گزری تو زندگی کے تمام رنگ سمیٹ کر ہمہ تن شاعری بن گئی۔ میرؔ کی تخلیقی قوت زندگی اور موت، خوشی اور غم، کامیابی اور ناکامی کے تمام رنگ سمیٹ کر مائل پرواز ہوئی تو ایک نئے سانچے میں ڈھل کر سامنے آئی۔ ایسی مثال میرؔ کے علاوہ اور کہاں مل سکتی ہے؟ ہم میرؔ کو اسی خوبی سے

ڈاکٹر حمیرا مسعود، ریڈر، شعبۂ اردو، اسمٰعیل نیشنل پی۔جی۔کالج، میرٹھ

پہچانتے ہیں۔

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا

ہر سخن اس کا ایک مقام سے ہے

اندازِ بیان کی سادگی و پرکاری اپنے طرز میں اکتسابی چیز نہیں، یہ کیفیت خود آگہی کے درکھولتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میرؔ کی شخصیت اور شاعری کے مطالعے سے یہ خوبیاں اور واضح ہو جاتی ہیں۔ بقول پروفیسر آل احمد سرورؔ :

> ''علم نفسیات شاعری کی قدر و قیمت متعین کرنے میں ہمیں کوئی مدد نہیں دے سکتا لیکن شاعر کی شخصیت، اس کے تخیل، اس کے لاشعور، اس کی محرومیوں اور سرشاریوں اس کے جذباتی مراکز اور ذہنی الجھنوں کو سمجھنے میں ضرور مدد دے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میرؔ کی شخصیت اور شاعری کے مطالعے سے بہت دلچسپ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔''

میرؔ کے ذہن، اُن کی انوکھی شخصیت اور ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا تجزیہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھا جائے جنھوں نے میرؔ کو کسی نہ کسی طور پر متاثر کیا۔ اُن کی شاعری کو سنوار کر جامعیت و ہمہ گیریت پیدا کی۔

دنیا ایک سرائے فانی اور انسان ایک مسافر۔ غور کریں تو میرؔ کی زندگی بھی ایک ایسا سفر ہے جس کی ابتدا سے انتہا تک کئی پڑاؤ اور کئی نشیب و فراز آئے۔ چنانچہ اکبرآباد سے شروع ہونے والا میرؔ کی زندگی کا سفر حادثات اور تجربات کی آماجگاہ بنا رہا۔ مصائب و آلام کا سلسلہ جو بچپن سے شروع ہوا تھا وہ مرتے دم تک قائم رہا۔ کبھی آسودگی میسر نہیں آئی۔ آخر زمانے کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے، اس کے سرد و گرم سہتے ہوئے، میرؔ کا یہ سفر ۱۸۱۰ء کو لکھنو کے محلہ سٹھٹی میں تمام ہوا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس دور کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۱۱۳۵ھ اور ۱۲۲۵ھ (۱۷۲۲ء اور ۱۸۱۰ء) کا زمانہ برعظیم کی تاریخ

میں انتشار وخلفشار کا دور ہے مغلیہ سلطنت کا زوال اور انگریزوں کا اقتدار اسی دور میں مکمل ہوا۔ معاشرے میں تہذیبی اور فکری سطح پر تبدیلی کا عمل بھی اسی زمانے میں شروع ہوا۔ نازک مزاج وحساس میرؔ بھی اسی معاشرے کے فرد تھے۔ اسی لئے خارجی اور داخلی طور پر وہ معاشرے کے عام فرد سے کہیں زیادہ متاثر ہوئے۔ ان کے ذاتی حالات اور اس دور کے المیوں نے ان کی شخصیت کو وہ بنا دیا جو وہ ہمیں نظر آتی ہے اور ان کی شاعری اس کشمکش کی ترجمان بن گئی جو ان کی ذات، معاشرے اور زندگی کی آویزش سے پیدا ہوئی تھی۔''

میرؔ کے کلام میں ایسے اشعار بہت ملیں گے جو اس بات کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں کہ میرؔ نے زندگی کا سفر کس طرح مکمل کیا۔ ان میں بیان کی نزاکت بھی قابلِ غور ہے اور کشمکش کی ترجمان بھی۔

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

میرؔ کی ذات، ان کی شاعری اور اس دور کے سیاسی حالات پر ڈاکٹر جمیل جالبی اس طور پر روشنی ڈالتے ہیں کہ میرؔ کی سیرت کے تمام نقوش ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ جن کا مطالعہ کئے بغیر میرؔ کا سمجھنا دشوار تو نہیں آسان بھی نہیں رہتا۔ لکھتے ہیں :

''۱۱۶۰/۱۷۴۷ء سے لے کر ۱۱۸۵/۱۷۷۱ء تک تقریباً بہ پچیس سال وہ مختلف امراء کے ملازم رہے مصاحبت کی، نوکری کی، سپاہی رہے، میدانِ جنگ میں گئے۔ سفارت کی خدمات انجام دی سفر کئے، مصائب اٹھائے، دکھ جھیلے، فاقہ کشی کی دست سوال دراز کیا، چھپر میں رہے۔ بیٹے کو چھپر تلے دبتے دیکھا، دلّی کو بار بار

لٹتے دیکھا، امیروں کو فقیر اور شاہ کو گدا بنتے دیکھا، بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتے دیکھیں، وارن ہیسٹنگز کی لکھنؤ میں آمد اور بیگماتِ اودھ پر اس کے ظلم و جبر کو دیکھا، مرہٹوں کی غارت گری، جاٹوں کی شورش، اور روہیلوں کی یورش سے مغلیہ سلطنت کی عظیم عمارت کو ڈھیر بنتے دیکھا۔ برعظیم میں انگریزوں کا اقتدار اور جنرل لیک کی فوجوں کا دہلی میں فاتحانہ داخلہ وہ واقعات ہیں جو میرؔ کے سامنے ہوئی اور جس نے ان کے دریائے احساس کو متلاطم رکھا۔ میرؔ نے ایک زندہ باشعور انسان کی طرح زندگی سے آنکھیں نہیں چرائیں بلکہ احساسِ زیست کو اپنی ذات کا حصّہ بنا کر اپنے تخلیقی وجود میں اتار لیا وہ ایک زندہ انسان کی طرح عُرس اور میلے ٹھیلوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ ہم صحبتوں میں گپ شپ اور ہنسی مذاق بھی کرتے ہیں۔ دوستوں اور معاصرین پر چست کئے ہوئے فقروں سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ ذکر میرؔ کے لطائف بھی اس دلچسپی کے شاہد ہیں میرؔ دنیا سے بے تعلق نہیں تھے۔''

میرؔ کی سیرت کے یہ تمام نقوش جن کا ذکر مندرجہ بالا اقتباس میں کیا گیا ہے ایک ایسے میرؔ کو ہمارے سامنے لاتے ہیں جو کمالِ فن کے ساتھ زندگی کے پردے پر ابھرتا ہے اور زندہ جاوید ہو جاتا ہے۔

رنجش کی کوئی اس کی روایت نہ سنی
بے صرفہ کسو وقت شکایت نہ سنی
تھا میرؔ عجب فقیر صابر شاکر
ہم نے اس سے کبھو شکایت نہ سنی

شخصیت کو بنانے میں وراثتی مسائل، بچپن کا دور، ماحول اور معاشرہ اور اس سے وابستہ کردار، بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔ ان کا ردِعمل غیر شعور طور پر ہمارے اندر وہی احساس پیدا کر دیتا ہے۔ میرؔ کو وراثت میں جنون ملا۔ ابتداء میں وحشت پیدا ہونے پر دروازہ بند کر کے ''ہجوم غم'' میں تنہا بیٹھ جاتے۔ پھر یہ وحشت اتنی بڑھی کہ لوگ ڈر کر ان سے بھاگنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ

''دیوانہ و مست کے مانند کف برلب ہاتھوں میں پتھر لئے پھرتا، میں
افتان و خیزاں اور لوگ مجھ سے گریزاں۔''

احساس کی اس شدت کو انھوں نے شاعری کی طرف موڑ کر اُسے ایک تعمیری سانچے میں ڈھال دیا۔ زندگی کے نشیب و فراز انھیں یا تو خیالی دنیا میں گم کر دیتے یا جنون میں مبتلا کر کے الگ تھلگ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتے۔ یہ چیزیں مستقبل کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھیں ۔ میرؔ ان تمام کیفیات (خوف و دہشت، احساسِ محرومی، ذہنی دباؤ اور الجھنوں) کا شکار ہوئے۔ بڑے لوگوں کی زندگی پر نظر ڈالیں تو اکثریت احساس کمتری، احساس برتری، احساس محرومی، ذہنی دباؤ اور نہ جانے کیسی کیسی نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار نظر آتی ہے مگر انھوں نے اپنی تمام کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ان محرومیوں سے دل برداشتہ نہیں ہوئے کہ اس کا رُخ مثبت اندازِ فکر کی طرف موڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکالا کہ انھوں نے نہ صرف زندگی میں بلکہ مرنے کے بعد بھی بڑے بڑے رتبے حاصل کئے۔ اقتصادی، سماجی، تہذیبی، جذباتی سطح پر بولتے ہوئے حالات، واقعات • ایک غیر یقینی صورتِ حال اور عام بدحالی نے اندازِ فکر کو متاثر کیا۔ چنانچہ زندگی کی بصیرت صورتِ حال اور عام بدحالی نے اندازِ فکر کو متاثر کیا۔ چنانچہ زندگی کی گہری بصیرت لئے میرؔ کی آواز جب گونجتی ہے تو ماحول کی عکاسی ہی نہیں کرتی بلکہ خود اُن کی شخصیت کے پیچ و خم کی مظہر ہو جاتی ہے۔

میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا

میرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میرؔ کے اس قسم کے اشعار پر غور کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ درد و غم، مایوسی و ناکامی نے میرؔ کو قنوطی نہیں بنایا بلکہ جینے کا ہنر سیکھا دیا۔ بقول آل احمد سرورؔ

''وہ اپنے اظہار میں اپنے دور سے بھی بلند ہو جاتے ہیں اور ذہنِ انسانی کے سربستہ رازوں سے بھی پردہ اٹھاتے ہیں جو ہر دور کے لئے کشش رکھتے ہیں۔''

میرؔ نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کیا، زندگی سے بھاگے نہیں، ڈرے نہیں، ڈٹ کر سامنا کرتے رہے۔ کمال یہ ہے کہ اپنے تجربوں میں سب کو شامل رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے وہ اتنی بڑی شاعری کر سکے۔ یہ اشعار دیکھئے تا کہ اندازہ ہو سکے کہ میرؔ نے دکھ اٹھائے، عمر کا ہر لمحہ مرمر کے گزارا مگر ہر دکھ ان پر انسانی فطرت کے رازوں کو آشکارا کرتا رہا ؎

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خون نابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مرمر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ہم میرؔ سے کہتے ہیں نہ تو رویا کر
ہنس کھیل کے ٹک چین سے بھی سویا کر
پایا نہیں جانے کا وہ درِ نایاب
کڑھ کڑھ کے عبث جان کو مت کھویا کر

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

شکوہ آبلہ ابھی سے میرؔ
ہے پیارے ہنوز دلّی دور

میرؔ نے ناکامیوں کا سامنا اسی لئے کیا تا کہ کامیابی حاصل کریں۔ ایسا کرنا دشوار ضرور

ہے مگر میر نے نہایت کامیابی سے اس مرحلے کو انجام دیا۔ ناواقفیت بدقسمتی اور ناکامی کو دعوت دیتی ہے۔ یہاں میر نہ صرف ہر چیز سے واقف ہیں بلکہ زمانہ شناس بھی ہیں۔ خود آگاہ ہیں ساتھ ساتھ دوسرے کے لئے بھی یہ در کھولتے دکھائی دیتے ہیں۔ زمانہ بدلتا ہے تو لوگوں کی نظریں بھی بدل جاتی ہیں اس کا اظہار کس خوبی سے کرتے ہیں ؎

ربط کا دعویٰ تھا جن کو کہتے تھے مخلص ہیں ہم
جانتے ہیں ذات سافی ہی کو ہم سب خاکسار
نقل کرتے کیا یہ صحبت منعقد جب ہوتی بزم
بیٹھ کر کہتے تھے منہ پر میرے بعضے بعضے یار
بندگی ہے خدمتِ عالی میں ہم کو دیر سے
کر رکھی ہے جان اپنی ہم نے حضرت پر نثار
سو نہ خط ان کا نہ کوئی پرچہ پہونچا مجھ تلک
واہ واہے رابطہ زحمت ہے یہ اخلاص و پیار
رفتہ رفتہ ہو گیں آنکھیں بھی اب میری سفید
بسکہ نامے کا کیا یاروں کے میں نے انتظار
لکھتے گر دو حرف لطف آمیز بعد از چند روز
تو بھی ہوتا اس دل بیتاب و طاقت کو قرار

خط کتابت سے یہ کہتے تھے نہ بھولیں گے کبھی
آویں گے گھر بار کی تیرے خبر کو بار بار
جب گیا میں یاد سے تب کس کا گھر کا ہے پاس
آفریں صد آفریں اے مردمانِ روزگار

ہے مثل مشہور یہ عمر سفر کو تاہ ہے
طالع برگشتہ بھی کرتے ہیں اب امداد کار

بس قلم کے ہاتھ سے جانے بھی دے یہ حرف میر
کاہ کے چاہے نہیں کہسار ہوتے بے وقار

یہاں ناواقفیت ناکامی کے در نہیں کھولتی بلکہ پہ در پہ مصائب کی خوفناک تاریکی، اس پر مخلص لوگوں کے رویہ کی بدصورتی میر پر اپنا پورا تسلط جما لیتی ہے

یارب رکھیں گے پنبۂ مرہم کہاں کہاں
سوزِ دروں سے ہائے بدن داغ داغ ہے

مدت ہوئی ہے زانوں سے اٹھتا نہیں ہے سر
کڑھنے سے رات دن کے ہمیں کب فراغ ہے

کیا کروں شرح خستہ جانی کی　　میں نے مر مر کے زندگانی کی
حال بہ گفتنی نہیں میرا　　تم نے پوچھا تو مہربانی کی

مسائل سے بھری ہوئی زندگی، لوگوں کے بدلتے رویے، ناسازگار حالات ان سب سے کیسے نمٹا جائے؟ ان مسائل کا تدارک کیسے کیا جا سکتا ہے؟ میر نے اُن مسائل کو بڑے خوبصورت انداز میں ظاہر کیا کچھ اس انداز سے کہ تاریکی کے بادل چھٹتے نظر آتے ہیں۔

شکوہ محبت ہے میر کہ کڑھتے ہیں سارے دن
یاں دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب

گزرا کیے جہاں میں خوشی سے تمام زور
کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

چرخ پر اپنا مدار دیکھئے کب تک رہے
اسی طرح روزگار دیکھئے کب تک رہے

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میرؔ
تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے

زندگی گزارنے کے لئے جس صبر وضبط اور حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ میرؔ زندگی سے وابستہ ہر مسئلے کا جس حوصلہ اور ہمت سے سامنا کرتے رہے اس کے لئے ہر کوئی اہل نہیں ہوتا۔ ذیل میں دئے اس شعر سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میرؔ
تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے

نہ وہ لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ — جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے
نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی — یہ خلق اور ان کی زبان اور ہے
تجھے گو کہ صد رنگ ہو جو مجھ سے کہیں — مرے اور اک مہربان اور ہے
ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میرؔ — زمین وزماں ہر زماں اور ہے

جہاں میرؔ رہنے کی جا گہ نہیں ہے
چلا چاہئے یاں سے اسباب کر بار

الجھنوں کا تدارک اس طرح کرنا صحیح نہیں الجھنوں کا نفسیاتی علاج خود اعتمادی ہے۔ جتنی یہ مضبوط اور مستحکم ہو گی شخصیت اتنی ہی مضبوط ہو گی۔ اس وقت ہر انسان کم وبیش ایسے ہی حالات واحساسات سے ورچار تھا۔ ایک عام انسان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ جذبوں کی گہرائی، ان کی طاقت اور تاثیر کو محسوس کر سکے۔ ایک باشعور انسان یا شاعر جب تک ان جذباتی

کشمکش سے دو چار نہیں ہوتا دوسروں کے دکھ کو محسوس نہیں کر سکتا۔ زندگی کیا ہے؟ جذبات واحساسات، تاثرات وتصورات اور توہمات کا بھنور، اگر ان کا مقابلہ نہیں کیا جائے تو یقیناً ان کے خوفناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ میرؔ ان تمام الجھنوں میں جکڑ کر پریشان تو ہوئے مگر ان پر قابو پانے کی کوشش بھی برابر کرتے رہے۔ بقول میرؔ ؎

نامرادانہ زیست کرتا تھا　　میرؔ کا طور یاد ہے ہم کو

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند　　یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

یاں کے سپید وسیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے　　رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

تاب کس کو جو حال میرؔ سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

رات کو رو رو صبح کرنا، دن کو جوں توں شام کرنا، حال میرؔ سننے کی تاب نہ لانا کے معنی یہ نہیں کہ اس دور کے عام انسانوں کی طرح ساری توجہ دنیا کی آسائش حاصل کرنے پر مذکور کر دی جائے بلکہ میرؔ اس کیفیت سے نقل کر زندگی کے ایک نئے رخ کو ہماری توجہ کا مرکز بنا دیتے ہیں اور سوچ کا رُخ اپنی ذات اور اس کے غم کی طرف موڑ کر شاعری اور انسان کا رشتہ براہ راست قایم کر دیتے ہیں۔ انسانی زندگی درد وغم اور مسلسل مسائل سے عبارت ہے۔ میرؔ بھی نامساعد حالات کا شکار ہوئے۔ بچپن کا دور گزرنے نہیں پایا کہ تلاش روزگار میں سرگرداں و پریشاں ہوئے، ماحول اور معاشرہ ناسازگار۔ غرض میرؔ وقت اور حالات کے ساتھ بہتے رہے۔ حالانکہ خود اعتراف کرتے ہیں۔

ہوئی ہے زندگی دشوار مشکل آساں کر
پھروں چلوں تو ہوں، پر میں وبال اپنا ہوں

حالات کے رُخ کو تو موڑ نہیں سکے کیونکہ قدرت کے آگے سب بے بس اور مجبور ہیں۔ بے چینی و بے قراری انتہا پر ہے، کربِ مسلسل ہے، صبر کا پیمانہ لبریز ہے، ہمت ٹوٹ گئی ہے مگر پھر بھی ایک

امید ہے۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

میرؔ کو ناقدری کا شدید احساس ہے۔ زیرِ نظر شعر سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس کیفیت میں لکھا گیا ہے۔

کوئی خواہاں نہیں ہمارا میرؔ
گویا جنسِ ناروا ہیں ہم

حسّیات کی شدت نے کئی مسائل پیدا کئے مگر ان نفسیاتی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے عام لوگ مختلف قسم کی لتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تنگ آ کر خود کشی کے بارے میں بھی سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ مسلسل مایوسی، بے زاری، محرومی، تنہائی اور گوشہ نشینی کی طرف مائل کرتی ہے۔ میرؔ اس کیفیت کا شکار ہوئے اور یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ۔

وسعت جہاں کی چھوڑ کر جو آرام چاہے میرؔ
آسودگی رکھے ہے بہت گوشہ مزار کا

لیکن یہ لمحاتی کیفیت جلد زائل ہو جاتی ہے۔ میرؔ نے ناکامی، خوف، ناسازگار حالات، معاشی بدحالی، معاشرے میں انتشار اور ناانصافی وغیرہ کے ساتھ ہر موڑ پر منتظر ایک کہانی اور ہر کہانی میں بے شمار حادثات و واقعات کی بہتات کو دیکھا۔ اس سے گھبرائے نہیں،

حالانکہ یہ جانتے تھے کہ ؎

ہم تو نام ہی جہاں میں رہے
یاں کبھو اپنا مدّعا نہ ہوا

حالات نے انھیں گوشہ نشیں ضرور کر دیا مگر ان مسائل کا سدِ باب ادب سے لگاؤ اور تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے کیا ؎

گرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ میرے شعر نے روئے زمیں تمام کیا

بے شک زندگی کے مسائل اور الجھنیں ایک ایسی دلدل ہیں جن سے ابرنا ناممکن، ان میں پھنس جانا کئی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو جانا ہے۔ ایک کامیاب شخصیت کا انحصار جسم پر نہیں ذہن پر ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کو کنٹرول کرنے والی طاقت ذہن ہے۔ میرؔ اپنے ذہن کو جب تخلیقی عمل کی طرف موڑتے ہیں تو پورے معاشرے کو ان تخلیقی تجربوں میں شریک کر لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے شعر نشتر بن کر ہمارے وجود میں پیوست ہو جاتے ہیں۔

حواشی:

۱۔ کلیاتِ میرؔ، جلد اوّل۔ ص۔۴۵، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۳ء
۲۔ محمد تقی میرؔ، ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ص۔۱۲۵، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلّی، ۲۰۰۱ء
۳۔ ایضاً ص۔۳۶
۴۔ میرؔ کی آپ بیتی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ص۔۱۱۵، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء
۵۔ کلیاتِ میرؔ، جلد اوّل، ص۔۴۹، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۳ء

تذکرہ نکات ءالشعراء

غزل اردو شاعری کی آبرو ہے اور اس صنف کی بادشاہت کے منصب پر فائز ہونے کا شرف میر تقی میر کو حاصل ہوا. یہاں میر کی شاعرانہ خوبیوں کی تفصیل بیان کرنا ہمارا موضوع نہیں ہے بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میر جب نثر میں اپنے قلم کا جوہر دکھاتے ہیں تو اردو ادب کی تاریخ میں بیش بہا اضافہ کرنے کے لئے ایک ایسا سرمایہ (نکات الشعراء) فراہم کرتے ہیں کہ آج تک اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ نکات الشعراء میر اور تاریخ اردو دونوں کے متعلق ایک نئے سرے سے غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

اردو کا پہلا تذکرہ کسے کہا جائے محققین کے لئے یہ ایک اہم سوال رہا ہے کیونکہ جس زمانے میں نکات الشعراء لکھا گیا اس دور میں اور بھی دوسرے تذکرے لکھے جا رہے تھے۔ سب نے اولیت کا سہرا اپنے سر باندھا تحقیق ایک مشکل کام ہے اور اس میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ محققین نے اس الجھے سوال کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آنند رام مخلص کی موت کا ذکر اور عبدالولی عزلت کے ہندوستان آنے کا ذکر غرض مختلف شواہد اس راہ کو ہموار کرتے ہیں کہ تذکرۂ میر ہی پہلے وجود میں آیا۔ مولوی عبدالحق اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ:

> ''اس وقت جتنے تذکرے دستیاب ہوئے ہیں ان میں نکات الشعراء کو تقدم حاصل ہے''۔ [1]
>
> گردیزی؛ قائم اور میر تینوں نے تذکرہ ایک ساتھ لکھنا شروع کیا لیکن سب سے پہلے میر کا تذکرہ ختم ہوا۔ جمیل جالبی نکات الشعراء کو اردو کا پہلا تذکرہ تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کا

ڈاکٹر فوزیہ بانو، ریڈر شعبۂ اردو، اسمٰعیل نیشنل مہیلا پی جی کالج، میرٹھ

اعتراف بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ میر نے اپنا متداول تذکرہ ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء میں ختم کر کے اسے شائع کر دیا قائم نے اپنا تذکرہ ۱۱۵۷ھ ۱۷۴۴ء میں شروع ضرور کر دیا تھا لیکن یہ ۱۱۶۸ھ ۵۵-۱۱۵۴ء میں مکمل ہوا اور ۱۱۷۶ھ ۶۳-۱۷۶۲ء تک اس میں اضافے ہوتے رہے۔ یہی صورت گردیزی کے ساتھ ہے کہ ان کا تذکرہ ۱۱۵۶ھ/ ۱۷۴۳ء میں شروع ضرور ہوا لیکن یہ بھی ۱۱۶۶ھ کے پہلے مہینے کی پانچ تاریخ (۱۲ نومبر ۱۷۵۲ء) کو مکمل ہو کر شائع ہوا۔ اس لئے شمالی ہند کے تذکروں میں نکات الشعراء کو اولیت حاصل ہے۔ پھر یہ تذکرہ اردو کے ایک عظیم شاعر کی تصنیف ہے جس کی مدد سے ہم اس کے مزاج، کردار، شخصیت، انداز فکر، معیارِ شاعری، متنازعات اور معرکوں وغیرہ سے واقف ہوتے ہیں اس لئے نکات الشعراء کی اہمیت ہمارے لئے اور بڑھ جاتی ہے''۔ [۲]

میر اور گردیزی دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے اور دونوں نے ہی اولیت کا دعویٰ کیا۔ پروفیسر محمود الٰہی بھی اس پہلو پر اتفاق کرتے ہیں کہ ان تذکروں کے منظرِ عام پر آنے میں وقفہ کم ہے ساتھ ہی ان تذکروں کے سلسلے میں ایک نئے پہلو پر غور و فکر کرنے پر زور دیتے ہیں۔

''ان دونوں تذکروں کے ضمن میں تقدم زمانی کی بحث کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ اہمیت ہے اس طرز فکر کی جس کے عمل اور ردعمل کے یہ دونوں تذکرے مظاہر ہیں۔'' [۳]

میر کو تذکرہ لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اس کا بہت سیدھا سا جواب دیتے ہیں

''پوشیدہ نماند کہ درفن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی

بزبان اردوئے معلیٰ شاہ جہان آباد دہلی، کتابے تا حال تصنیف نشدہ
کہ احوال شاعران ایں فن بصفحۂ روزگار بماند۔ بناءً علیہ ایں تذکرہ
کہ مسمّیٰ بہ نکات الشعراء، است، نگاشتہ می شود۔'' ۴

نکات الشعراء کا غائر مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ میر کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کا مقصد کہیں نہ کہیں دوسروں کی نکتہ چینی تھا۔ پروفیسر محمود الٰہی اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کی تذکرہ کا سبب تصنیف جتنا ظاہر ہے اس سے کہیں زیادہ پوشیدہ ہے۔

''میر نے بھی نکات الشعراء کے سبب تالیف پر روشنی ڈالی ہے لیکن
انھوں نے ذہانت سے کام لیا اور کہا کہ وہ تذکرہ اس لئے لکھ رہے ہیں
کہ صفحۂ روزگار پر ریختہ گویوں کا نام اور کام باقی رہے۔ حقیقت اس
کے برعکس ہے۔ ان کا تذکرہ کسی اور جذبے کی غمازی کر رہا ہے۔۔۔
وہی جذبہ جس پر گردیزی چیں بہ جبیں نظر آتے ہیں۔'' ۵

آب حیات میں محمد حسین آزاد نے اس کے کم یاب ہونے کا ذکر کیا ہے وہیں پروفیسر محمود الٰہی بھی نکات الشعراء کی تدوین نسخہ ءپیرس ۱۹۷۰ء کے وقت لکھتے ہیں کہ :

''نکات الشعراء کو اگر چہ قبول عام ملا لیکن اس کے قلمی نسخے
تعجب خیز حد تک کمیاب ہیں۔ انجمن نے اسے دو بار شائع کیا۔ پہلی
بار ۱۹۲۲ء میں مولوی حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے مقدمہ کے
ساتھ اور دوسری بار ۱۹۳۵ء مولوی عبدالحق کے حواشی اور مقدمے کے
ساتھ۔'' ۶

''ڈاکٹر عبادت بریلوی ۱۹۸۰ء میں اسے لاہور سے طبع کیا۔'' ۷

نکات الشعراء میں شاعروں کے ذکر میں میر کسی خاص اصول کے پابند نظر نہیں آتے۔ انھوں نے شاعروں کی تقسیم نہ تو طبقات کے لحاظ سے کی اور نہ ان کا ذکر حروف تہجی یا

حروف ابجد کی ترتیب سے کیا۔ نکات الشعراء میں کل ۱۰۴ شاعروں کا ذکر ملتا ہے جن میں ۱۰۳ شاعروں کا ذکر انجمن کے نسخہ میں موجود ہے اور نسخہ ء پیرس میں ۷۷ شعراء کا ذکر ہے جس میں ایک نئے شاعر عطا بیگ ضیاؔ کے ترجمہ کا اضافہ ہے۔

میر نے دکن کے ۳۲ شاعروں کو نکات الشعراء میں جگہ تو دی لیکن یہ ذکر دکنی شعراء کے متعلق تشنگی کو قائم رکھتا ہے۔ ولیؔ کا ذکر صرف چھ سطروں پر محیط ہے اور باقی شعراء کے صرف ایک شعر کو جگہ دے کر تذکرہ نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ دراصل نکات الشعراء کے مآخذ کا انحصار عبدالوی عزلت کی بیاض پر تھا دوسرے میر ان شعراء کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ میر نے یہ تذکرہ بڑی رواداری میں لکھا اور میر اس کام کو جلد از جلد پورا کر لینا چاہتے تھے۔ میر اردو شاعری کے آغاز میں دکن کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں پھر بھی دکنی شعرا کے ذکر میں ان کا قلم رک رک کیوں چلا اس کا جواب وہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں

> ''اگر چہ ریختہ از دکن است، چوں از آں جا یک شاعر مربوط برنخواستہ، لہذا شروع بنام آنہا نکردہ وطبع ناقص مصروف ایں ہم نیست کہ (از) احوال اکثر آنہاں ملال اندوز گردد مگر بعضے از آنہا نوشتہ خواہد شد۔'' ۸

شعرائے دکن کے سلسلے میں اس مختصر ترین ذکر پر ڈاکٹر جمیل جالبی کا نقطۂ نظر حقیقت کے نزدیک معلوم ہوتا ہے۔

> ''میر دکنی شاعری اور اس کی طویل روایت سے ناواقف تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ روایت، جس کے وہ خود ایک ممتاز نمائندہ ہیں، دکنی شاعری کی روایت ہی کا فیض ہے۔'' ۹

دکنی شعراء کے مختصر ترین ذکر کے باوجود نکات الشعراء کی اہمیت مسلم ہے کہ اس کے ذریعہ ان شعراء کا نام صفحہ ء ہستی سے مٹنے سے رہ گیا اور تلاش وتحقیق کا ایک نیا باب کھول دیا۔

میر نے جہاں دکن کے شعراء کے ذکر میں خانہ پری کی وہیں دوسری طرف شمالی ہند کے جن شعراء کو جگہ دی اس میں ان کا نقطۂ نظر معاصرانہ چشمک، گروہ بندی، ذاتی تعلقات، پسند نا پسند کا صاف مظہر ہے۔ میر نے ذاتی تعلقات کی بنا پر بہت سے شعراء کی تعریف کی جو ان کے مداح، تلامذہ یا اعزا تھے۔ انھوں نے ایک طرف جہاں خان آرزو کے نزدیک شاعروں کی تعریف کی اور ان کا تفصیلی ذکر کیا۔ وہیں مظہر جان جاناں سے قرابت داروں کو ہدف ملامت بنایا۔ یقین جو کہ مظہر جان جاناں کے خاص شاگردوں میں سے تھے کا ذکر اس تحقیر آمیز جملوں میں کیا کہ یقین کی عزت تو خاک میں ملا ہی دی مظہر جان جاناں کی شخصیت پر بھی سوالیہ نشان لگا دیے۔

''انعام اللہ (خاں) یقین تخلص، شاعر ریختہ، صاحبِ دیوان (است) از بسکہ اشتہار دارد محتاج بہ تعریف وتوصیف نیست۔ تربیت کردہء مرزا (جان جاناں) مظہر است۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آمدم برسر مطلب، میاں یقین را مردماں می گفتند کہ مرزا مظہر او را شعر گفتہ می دہد ووارث شعرہائے ریختہء خود گردانیدہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔القصہ پر دبوچے چند کہ یافتہ است، کہ ما وشما نیز می توانم یافت، ایں قدر برخود چیدہ است کہ رعونت فرعون پیش او پست، است برزمیں می گذارد (و) بعد از ملاقات ایں قدر خود معلوم شد کہ ذائقۂ شعر فہمی مطلق ندارد۔'' [10]

غرض میر نے یقین پر اعتراضات کی بوچھار کر دی۔ پروفیسر محمود الٰہی اس ضمن میں اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ۔۔

''میر نے سخت ترین جملہ یقین پر ہی کیا کہ میرِ کارواں کو زیر کرنا سب سے بڑی جیت ہوا کرتی ہے۔'' [11]

میر کے قلم سے یہ سلسلہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا نظر آتا۔ خاکسار کے کلام میں انھیں

جلے ہوئے کباب کی بو آتی ہے تو قدرت اللہ قدرت کی شاعری سے بھی بے زار ہیں۔ محمد علی حشمت انھیں گپ ہانکتے نظر آتے ہیں غرض انھوں نے چن چن کر اس حلقے کے شعراء کو ہدف طعن و تشنیع بنایا۔

میر نے جن شاعروں کی توہین کی ان میں اپنے وقت کے قادر الکلام شاعر شاہ حاتم بھی ہیں۔ باقی تذکرہ نگاروں نے انھیں عیب سے مبرا قرار دیا اور ان کی شخصیت اور فن کو جس مرتبہء کمال پر پہونچایا پروفیسر عبدالحق ان الفاظ میں ان خوبیوں کا بیان کرتے ہیں

''تذکرہ نگاروں نے انھیں نہایت مہذب ،شریف، متین، جہاں دیدہ، مرد بزرگ، عالی فطرت، عالی طبیعت، بلند ہمت، سنجیدہ ،ذی فہم۔ صاحب کمال و فن، مرد خلیق ،متوکل، پاکیزہ خیال حیرفی ءطبع مرد درویش، خوش پوش و خوش مزاج بتایا ہے۔'' ۱۲

لیکن میر کو حاتم کے یہاں کوئی خوبی نظر نہیں آتی بلکہ ان کی شخصیت میں وہ عیب در عیب کی پرت کھولتے نظر آتے ہیں

''مرد یست جاہل و متمکن و مقطع وضع، دیر آشنا (مدمغ) غنا ندارد و دریافتہ نمی شود کہ ایں رگ کہن بسبب شاعری است کہ ہمچو من دیگرے نیست یا وضع او ہمیں است۔'' ۱۳

میر کے اس رویہ پر کسی کا ذکر کیا، کسی کو چھوڑ دیا، کسی کا ایسا پہلو پیش کیا جس سے تشنگی باقی رہی۔ کچھ کا مذاق اڑایا، کچھ قدآور شعراء کی تذلیل میں انتہا کی حدیں پار کر دیں پروفیسر جمیل جالبی یہ رائے قائم کرتے نظر آتے ہیں۔

''میر کی رائے پر ان کی انانیت خود پرستی، گروہ بندی اور ذاتی تعلقات اور عناد کا گہرا اثر ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ میر صاحب

فطرتاً کینہ پرور تھے اور ان کے ہاں معافی کا کوئی خانہ نہیں تھا لیکن ان
کے یہ سارے عیب ان کی شاعرانہ عظمت نے چھپا لیے ہیں۔'' ۱۴

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ یہ تذکرہ معاصرانہ چشمک کی وجہ سے منصۂ شہود پر آیا ۔گردیزی نے تذکرہ ریختہ گویاں کا محرک صاف طور پر ظاہر کر دیا کہ ان کا مقصد انصاف کرنا ہے۔غرض اپنے مقصد کی تکمیل کرتے ہوئے انھوں نے بھی میر کا ذکر صرف پانچ سطروں میں کیا اور مثال کے لیے ایک شعر دے دیا۔غرض دوسروں نے بھی میر کو نہیں بخشا اور اس تلخی اور زہرناکی کی مخالفت تذکروں میں صاف لفظوں میں نظر آنے لگی ۔حنیف نقوی شعرائے اردو کے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

''میر کی زندگی ہی میں ان کی اس کج ادائی اور نا مناسب
روش کے خلاف ردعمل کا آغاز ہو گیا تھا۔گردیزی نے ''تذکرہ ریختہ
گویاں''میں شفیق اورنگ آبادی نے ''چمنستانِ شعراء'' میں ابوالحسن
امر اللہ الہ آبادی نے ''مسرت افزا'' میں میر غلام حسین شورش عظیم
آبادی نے ''رموز الشعراء'' معروف بہ ''تذکرہ شورش'' میں اور حکیم
قدرت اللہ قاسم نے مجموعہ نغز'' میں اس موضوع پر جس قدر خامہ
فرسائی کی ہے وہ سب اسی مخالفانہ تحریک کا ایک جز ہے۔'' ۱۵

نکات الشعراء میں میر نے شعراء کے حالاتِ زندگی، واقعات کا ذکر بہت مختصر طور پر کیا اسکی ایک وجہ میر یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ دوسرے تذکروں میں شاعروں کے حالات کا تفصیلی ذکر موجود ہے تو انھیں خود بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ڈاکٹر حنیف نقوی میر نے اجمال کا جو سہارا لیا اس کو صحیح نہیں مانتے ہیں اور ساتھ ہی یہ شکایت بھی کرتے ہیں۔

''میر صاحب سے صرف شکوہ نہیں کہ انھوں نے حالات
زندگی کے انضباط پر بقدر ضرورت توجہ صرف نہیں کی بلکہ یہ شکایت

بھی ہے کہ وہ تقریباً تیس شاعروں کے معاملے میں صرف ان کے
نام یا تخلص کے ساتھ اشعار کی نقل پر اکتفا کر کے حد درجہ بے توجہی اور
سہل پسندی کے مرتکب ہوئے۔'' ۱۶

نکات الشعراء میں میر جا بجا شعراء کے کلام پر اصلاح کرتے نظر آتے ہیں۔ قاضی عبدالودود اس نتیجے پر پہونچے کہ میر نے ایک سو دس اشعار پر اصلاح دی جن میں شعرائے دہلی کے سرخیل حاتم کے علاوہ آبرو، مضمون، ناجی، یکرنگ، یقین، سجاد، خاکسار، ٹیک چند ہیں۔ میر کی اصلاح کے پس پردہ بھلے ہی ذاتی عناد کارفرما رہے ہوں اس سے صاف طور پر میر کی برتری کا احساس ہوتا ہے اور اس بات کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

''ضروری نہیں کہ ان تمام اصطلاحات یا مشوروں کو بغیر کسی
چوں و چرا اور پس و پیش کے قبول کر لیا جائے لیکن یہ بات بہر حال
ماننا پڑتی ہے کہ میر کی نکتہ رس نگاہ شعر کے نازک ترین پہلوؤں تک
پہونچنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے
بعض اشعار میں معمولی ترمیم و تغیر کے ذریعہ وہ ظاہری و معنوی
لطافت و بلاغت پیدا کر دی ہے جو اس سے قبل مفقود تھی یا پوری طرح
ابھر کر سامنے نہ آسکی تھی۔'' ۱۷

میر نے شاعروں کے کلام پر جو اصلاح دی اس سے میر کا نظریہء شعری واضح ہو جاتا ہے۔ ایہام کو وہ شاعری کے لیے گھن قرار دیتے ہیں تو محاوروں میں تصرف کے وہ قائل نہیں۔ غرض وہ زبان و بیان میں حد درجہ حزم و احتیاط برتتے ہیں۔ اس دور میں نقد و نظر کا یہی اصول تھا اور میر کا تذکرہ اس کا پابند نظر آتا ہے۔

''لفظوں اور محاروں کے استعمال میں احتیاط اور اظہار کو
بہتر و موثر بنانے کی کوشش یہی اس دور کے تنقیدی معیار تھے۔ کوئی

شعر پسند آیا تو اس پر واہ کہہ دیا اور تعریف کر دی اور اس میں کوئی لفظی سقم یا محاورہ و زبان کا غلط استعمال نظر آیا تو اس پر اعتراض کر دیا۔ تنقید میں رجحانات ،میلانات ،خیالات اور مزاج شاعری کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ یہ روایتی معاشرہ تھا اور فرد کے ذہن میں اچھے اور برے کے معیار پورے طور پر واضح تھے۔ نکات الشعراء میں نقد و نظر کی یہی نوعیت ہے۔'' ۱۸؎

نکات الشعراء میں میر نے جہاں شعراء اور اس کے حسن و قبح کے متعلق اپنے موقف کو پر اثر طریقے سے بیان کیا وہیں وہ چند جملوں میں شعراء کی شخصیت کا نقشہ بھی کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے شاعر کی پوری تصویر ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ایسے میں میر جہاں ایک طرف بڑی خوبی سے ان کے معائب کا ذکر کرتے ہیں یا ان کا مذاق اڑاتے ہیں وہیں دوسری طرف اپنی برتری اور تخلیقی صلاحیت کا احساس کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اپنی انفرادیت کو یہاں بھی بخوبی قائم کر لیتے ہیں۔

''اس تذکرے کے مطالعے سے میر، آبِ حیات کی قلمی تصویر کے بر خلاف ،ایک ہنگامہ پرور، محفل آرا، مجلس پسند، معرکہ باز، اور گروہ بند کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔'' ۱۹؎

نکات الشعراء اردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے ساتھ ہی میر کے مرتبہ کو بلند مقام عطا کرتا ہے نکات الشعراء کی خوبیوں کے سلسلے میں پروفیسر محمود الٰہی کے اس قول کو مطالعے کا حاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔

''نکات الشعراء کی خصوصیات پر اہل نظر نے بہت کچھ کہا ،یہاں ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہی ہے کہ یہ ہمارے ایک ایسے شاعر کے رشحات قلم

ہیں جس نے غزل کی تقدیر بدل دی۔ ایسے شاعر کا ایک ایک جملہ بلکہ ایک ایک حرف ہمارے کام آ سکتا ہے اور پھر نکات الشعراء میں تو میرؔ کی شخصیت بھرپور طریقے سے جلوہ گر ہوئی ہے اس لئے اس کے مطالعے کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوگی۔ یہ دراصل دوسرے شاعروں کا تذکرہ کم اور خود میرؔ کا اپنا تذکرہ زیادہ ہے''۔ [۲۰]

تیس سال کی عمر میں میر نے اردو دنیا کو ایسا بیش بہا خزانہ دیا جس کی مثل بے نظیر ہے۔

حواشی:

(۱) اردو تذکروں میں نکات الشعراء کی اہمیت۔ ایم کے فاطمی ص ۴۴

(۲) محمد تقی میر۔ جمیل جالبی ص ۵۰

(۳) نکات الشعراء۔ پروفیسر محمود الٰہی ص ۹۔۱۰

(۴) نکات الشعراء۔ پروفیسر محمود الٰہی ص ۲۳

(۵) نکات الشعراء ۔ پروفیسر محمود الٰہی ص ۱۰

(۶) نکات الشعراء ۔ پروفیسر محمود الٰہی ص ۱۶

(۷) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ۔ ڈاکٹر سلیم اختر ص ۱۶۲

(۸) نکات الشعراء ۔ پروفیسر محمود الٰہی ص ۲۳

(۹) تاریخ ادب اردو (جلد دوم حصہ اوّل) ۔ جمیل جالبی ص ۵۳۳

(۱۰) نکات الشعراء ۔ پروفیسر محمود الٰہی ص ۸۲۔۸۳

(۱۱) نکات الشعراء ۔ پروفیسر محمود الٰہی ص ۱۲

(۱۲) شاہ ہاتم ۔ پروفیسر عبدالحق ص ۹۔۱۰

(۱۳) نکات الشعراء ۔ پروفیسر محمود الٰہی ص ۷۷

(۱۴) تاریخ ادب اردو (جلد دوم حصہ اوّل) ۔ جمیل جالبی ص ۵۳۴۔۵۳۵

(۱۵) شعرائے اردو کے تذکرے ۔ حنیف نقوی ص ۲۳۱

(۱۶) شعرائے اردو کے تذکرے ۔حنیف نقوی ص ۲۲۱
(۱۷) شعرائے اردو کے تذکرے ۔حنیف نقوی ص ۲۴۰
(۱۸) تاریخ ادب اردو (جلد دوم حصہ اوّل) ۔جمیل جالبی ص ۵۳۶
(۱۹) تاریخ ادب اردو (جلد دوم حصہ اوّل) ۔جمیل جالبی ص ۵۳۸
(۲۰) نکات الشعراء ۔پروفیسر محمود الٰہی ص ۱۶

شیریں زبان، شکستہ دل شاعر میر تقی میرؔ

میں کیا کہوں جگر میں لہو میرے کم ہے کچھ
کچھ تو الم ہے دل کی جگہ اور غم ہے کچھ

دنیائے اردو ادب میں شیریں زبان، شکستہ دل اور عظیم المرتبت شاعر میر تقی میرؔ کو خدائے سخن کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ وہ شاعر ہے جس نے اپنی آنکھیں مفلسی اور تنگ دستی کی آغوش میں کھولیں اور ایک صوفی فقیر باپ کا بیٹا ہونے کی بنا پر صبر وقناعت کے گہوارے میں پرورش پائی۔ وراثت میں علاوہ کچھ کتابوں کے اور کچھ نہ ملا لیکن ان کتابوں پر بھی ان کے سوتیلے بھائی نے قبضہ کرلیا۔ غریبی اور بدحالی کی انتہا یہ تھی کہ باپ کے انتقال کے وقت گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ بلکہ باپ خود تین سو روپئے کے مقروض تھے ایسے برے وقت میں میرؔ کے والد کے ایک مرید نے پانچ سو روپئے کا تعاون پیش کیا۔ میرؔ نے اس میں سے تین سو روپئے کا قرض ادا کر کے باقی روپیوں کی مدد سے اپنے غریب باپ کو سپردِ خاک کیا۔

اس طرح میرؔ کا بچپن بڑی غریبی وعسرت میں گزرا۔ عہد طفلی میں ہی قسمت نے انہیں بے سہارا کر دیا۔ ایسے برے وقت میں میرؔ نے اپنے سوتیلے بھائی کے ماموں خان آرزو کے یہاں پناہ لی۔ لیکن خان آرزوؔ نے یتیم میرؔ کے سر پر دستِ شفقت رکھنے کے بجائے ان کے ساتھ برا سلوک کیا۔ اس طرح ڈوبتے کو تنکے کا جو سہارا تھا میرؔ سے وہ بھی چھن گیا اور میرؔ کو تلاش معاش میں در۔ در بھٹکنا پڑا۔ میرؔ کا وہ بچپن جو کھیل کود اور لاڈ و پیار میں صرف ہونا چاہئے تھا فکر معاش میں گزر گیا۔ یہاں تک کہ انہیں اپنا وطن بھی ترک کرنا پڑا۔ عہدِ نوجوانی میں ہی میرؔ نے آگرہ چھوڑ کر دلّی کی سکونت اختیار کر لی۔

میرؔ کے آگرہ چھوڑنے کی ایک اور بڑی وجہ ان کی محبوبہ تھی۔ آگرہ میں ان پر کسی پری رو

ڈاکٹر لائق فاطمہ نقوی، صدر، شعبۂ اردو، ای۔سی۔سی۔، الہ آباد

اور پری پیکر معشوق نے جادو کر دیا تھا، میرؔ اس کے عشق میں دیوانے ہو گئے تھے۔ آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی لیکن محبت کی پینگیں جب اس حد تک بڑھ گئیں کہ رسوائی اور بدنامی ہونے لگی تو مجبوراً میرؔ کو اپنا آبائی وطن ترک کرنا پڑا اور اس طرح میرؔ کے محبوب کی گلیاں جو کوچۂ دلبر تھیں اب کوچۂ قاتل بن گئیں۔ جن کا اثر میرؔ کی شاعری اور خاص طور سے میرؔ کی غزلوں پر پڑنا لازمی تھا۔ اس کا اندازہ ان کے درد و یاس میں ڈوبے ہوئے ان اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے ؎

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

جیسے حسرت لئے جاتا ہے جہاں سے کوئی
آہ یوں کوچۂ دلبر سے سفر ہم نے کیا

قدم دشتِ محبت میں نہ رکھ میرؔ — کہ سر جاتا ہے گامِ اوّلیں پر

جی ہی دینے کا نہیں کڑھنا فقط
اس کے در سے جانے کی حسرت بھی ہے

اب کیا کریں نہ صبر ہے دل کو نہ جی میں تاب — کل اس گلی میں آٹھ گھڑی گش پڑے رہے
جب تک اکڑ اٹھائی گئی ہم کڑے رہے — اک ایک سخت بات پہ برسوں اڑے رہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

میرؔ جب دلّی تشریف لائے تو ایک طرف تو ان کے سینے میں غمِ عشق پیوست تھا تو دوسری طرف غمِ روزگار کی آگ بھڑک رہی تھی۔ یہ دونوں ہی غم (غمِ عشق اور غمِ روزگار) میرؔ کے سینے میں اس طرح گھل مل گئے تھے اور اور اس طرح ایک دوسرے پر حاوی ہو گئے تھے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ میرؔ نے اپنے شعر میں کون سا غم پیش کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان غموں نے ان کی شاعری کو رنج و غم اور درد و الم کا مرقع بنا دیا۔

میرؔ کی شاعری یاس وحسرت، درد وغم، کسک وتڑپ اور جوش واثر کا ایسا حسین سنگم ہے کہ آج دوڈھائی سوسال سے زیادہ وقت گزر جانے کے باوجود ان کے اشعار کی تازگی اسی طرح قائم ہے۔ حالانکہ میرؔ نے قریب قریب ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مرثیہ اور غزل وغیرہ۔ لیکن ان سب میں میرؔ نے غزل کے میدان کو اس طرح فتح کیا کہ آج تک اس کا فاتح کوئی اور نہ بن سکا۔ اردو قصیدہ نگاری میں جو مقام وعظمت مرزا محمد رفیع سوداؔ کو حاصل ہے، اردو مثنوی نگاری میں جس رتبہ ومرتبہ وبلندی کے حامل میر حسنؔ ہیں اور اردو مرثیہ نگاری میں میر انیسؔ جس طرح بادشاہت کے عہدے پر آج بھی قائم ہیں اسی طرح میرؔ کے انتقال کو دوسوسال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی اردو غزل کی بادشاہت کا تاج میر تقی میرؔ کے ہی سر کو مزین کئے ہوئے ہے۔ یعنی اٹھارہویں صدی سے لیکر آج اکیسویں صدی کی طویل مدّت میں بھی اردو غزل نے میر تقی میرؔ کے علاوہ کسی اور شاعر کو اپنا بادشاہ بنانا قبول نہیں کیا۔ یہ مرتبہ، یہ عظمت، یہ بلندی صرف میرؔ کے ہی حصّہ میں آئی ہے۔ اردو غزل کے عہدِ طفلی سے لیکر آج تک لاتعداد غزل گو شعراء نے ایک سے بڑھ کر ایک غزلیں کہیں لیکن میرؔ کے پایہ تک کوئی بھی شاعر نہ پہنچ سکا۔ بلکہ اردو غزل کے بڑے بڑے شاعروں نے بھی میرؔ کی عظمت وبلندی کو قبول کیا ہے۔ مثلاً مرزا سوداؔ جو کسی بھی شاعر کو ہم پلّہ خیال نہ کرتے تھے، غزل کے میدان میں میرؔ کو ہی اپنا استاد تسلیم کیا ہے ؎

سوداؔ تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میرؔ سے استاد کی طرف

غالبؔ اس طرح فرماتے ہیں ؎

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

اور دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میرؔ کے شعر کے احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

غالبؔ کے معاصر ذوقؔ فرماتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

حسرت موہانی نے میرؔ کے مرتبہ کا اعتراف اس طرح کیا ہے ؎

شعر میرے بھی ہیں پُر درد و لیکن حسرت
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

اکبرؔ کا میرؔ کی شان میں سر تسلیم خم کرنے کا انداز دیکھئے ؎

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبرؔ
ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میرؔ کے ساتھ

اور فراقؔ کے لفظوں میں ؎

جس کو کہتے ہیں لوگ شعر فراقؔ میرؔ ہی کا شعار ہے، کیا ہے

حالانکہ میرؔ کا زمانہ غزل گوئی کے اعتبار سے دورِ زرّیں تھا۔ اس دور کے بلند پایہ غزل گو شعراء میں مرزا سوداؔ، میر دردؔ، قائم چاند پوری، انعام اللہ خاں یقینؔ، عبدالحئی، تاباںؔ اور میر سوزؔ پر سوزؔ وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن میرؔ کا انداز بیان ان سب سے بالکل جدا ہے۔ چونکہ میرؔ کی شاعری ان کی پُر درد زندگی کے تلخ حقائق کی ایک داستان ہے اس لئے ان کے یہاں درد و غم اور رنج و الم کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کے یاس و حرماں، در بدری، مایوسی و بے بسی۔ عشق میں ناکامی عزیزوں کی بے وفائی وغیرہ کا ذکر بڑے ہی سوز و گداز کے ساتھ میرؔ نے

اپنی غزلوں میں جا بجا کیا ہے۔ اسی لئے میرؔ کا انداز بیان، ان کا لب ولہجہ اور ان کی آواز، ان کے معاصر کے درمیان بھی سب سے الگ پہچانی جاسکتی ہے۔ میرؔ نے شعر کے پردے میں اپنے زخموں کو جو داستان سنائی ہے اس کے متعلق خود فرماتے ہیں ؎

شعر کے پردے میں میں نے غم سنایا ہے بہت
مرثیے نے دل کے میرے بھی رلایا ہے بہت

دراصل میرؔ نے زندگی بھر مصیبتوں کا سامنا کیا ہے گویا مصیبتیں اور پریشانیاں ہی ان کا مقدر تھیں۔ محبت میں ناکامی، ترک وطن کی صعوبتیں، تنگدستی، دلّی کے سیاسی حالات وغیرہ نے ہی میرؔ کی شاعری کو جلا بخشی۔ میرؔ خود بھی اپنے دیوان کو درد وغم کا مجموعہ کہتے ہیں۔ دیکھئے یہ اشعار اپنے اندر کتنی کسک، تڑپ، درد اور تاثیر رکھتے ہیں ؎

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیواں میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کے صاحب میں نے دردوغم کتنے کیے جمع سو دیوان کیا

مصرع کوئی کوئی کبھی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

زمانے کے ساتھ ہی ساتھ میرؔ کو بھی اپنی برتری اور عظمت کا بھرپور احساس تھا تبھی تو شاعری کے متعلق انھوں نے اس طرح کے اشعار نظم کئے ہیں۔ جس میں شاعرانہ تعلّی سے کہیں زیادہ حقیقت اور واقعیت موجود ہے ؎

اگرچہ گوشہ نشیں ہوں میں شاعروں میں میرؔ
پہ میرے شعر نے روئے زمیں تمام کیا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

جہاں سے دیکھئے اک شعر شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں کا

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

مفت یوں ہاتھ سے نہ کھو ہم کو کہیں پیدا بھی ہوتے ہیں ہم سے

واقعی یہ مقبولیت اور یہ شہرت اردو کے کسی اور شاعر کو نصیب نہ ہو سکی۔ میرؔ کے پُر خلوص جذبات نے ان کی غزلوں میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ میرؔ کے پاس ایک دردمند دل تو تھا ہی، عشق کی شدت، ہجر کی اذیت اور ناموافق حالات نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ میرؔ نے اپنی غزلوں میں بڑے ہی پُر درد انداز میں لیکن شیریں اور ملائم الفاظ میں اپنے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ مثلاً ؎

احوالِ میرؔ کیونکر آخر ہوا ایک شب میں اک عمر ہم یہ قصہ تم سے کہا کریں گے

جب رونے بیٹھتا ہوں تب کیا کسر رہے ہے
رومال دو دو دن تک جوں ابر تر رہے ہے

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے
اک آگ سی لگی ہے کیا جانئے کہ کیا ہے

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

کٹے ہے دیکھئے یوں عمر کب تلک اپنی

کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کیجیے

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

ستم اٹھانے کی طاقت نہیں ہے اب اس کو

جو دل میں آوے تو ٹک رحم میرؔ پر کر یے

میرؔ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادہ بیانی ہے۔ وہ عام فہم الفاظ میں درد و غم اور سوز و گداز سے پُر باتیں ایسے پُر اثر انداز میں بیان کرتے ہیں کہ خاص و عام، ہر ایک کے دلوں پر نقش ہو جاتا ہے۔ میرؔ کا کمال یہ ہے کہ ان کی غزلوں کا سیدھا سادہ اندازِ بیان اپنے اندر غضب کی شیرینی اور جوش رکھتا ہے۔ ان کی غزلوں کا ایک ایک لفظ اپنے اندر ایسی تاثیر رکھتا ہے کہ پڑھتے وقت دل پر چوٹ کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دراصل میرؔ کے اشعار ''دیکھن میں چھوٹے لگیں گھاؤ کریں گمبھیر'' کا مصداق بن جاتے ہیں۔ اس طرح کے کچھ منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ

نادان جی سے پھر وہ بھلایا نہ جائے گا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا

دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا　　تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

بالیں پہ میری آوے گا تو گھر سے جب تلک

کر جاؤں گا سفر ہی میں دنیا سے تب تلک

ہم نے اپنی سی کی بہت لیکن　　مرضِ عشق کا علاج نہیں

اک بیمار جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر

پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں

کہیں جو کچھ ملامت گر بجا ہے میرؔ کیا جانیں
انہیں معلوم تب ہوتا کہ ایسے سے جدا ہوتے

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے
گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک
شعلہ اک صبح یاں سے اٹھتا ہے

عشق اک میرؔ بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

موئے ہی جاتے ہیں ہم درد عشق سے یارو
کسی کے پاس اس آزار کی دوا بھی ہے

رونے میں دن کٹے ہیں، آہ و فغاں میں راتیں
گر شغل ہے تو یہ ہے، مذکور ہے تو یہ ہے

کہتا ہے کوئی عاشق کوئی کہے ہے خبطی
دنیا سے بھی نرالا رنجور ہے تو یہ ہے

منھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا
حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

تاب کس کو جو حالِ میرؔ سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

نہیں لاتا دلِ زار اب
بہت ہم نے صبر و تحمل کیا

محبت ہے یا کوئی جی کا ہے روگ
سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا

کچھ نہ پوچھو بہک رہے ہیں ہم
عشق کی مئے سے چھک رہے ہیں ہم

نازکی ان کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

سوکھ غم سے ہووے ہیں کانٹا سا
پر دلوں میں کھٹک رہے ہیں ہم

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

ظلم ہے قہر ہے قیامت ہے غصے میں اس کے زیرِ لب کی بات
کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانیے یہ کب کی بات

اگرچہ میرؔ نے اپنی غزلوں میں ایسے دلآویز اشعار پیش کر کے اپنے عشقیہ جذبات اور نجی حالات کی ترجمانی کی ہے لیکن کچھ اس سحر انگیز انداز میں کہ ان کے اپنے نجی خیالات اور ذاتی حالات ہمارے اپنے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ جو کچھ میرؔ کی زبان سے نکلتا ہے وہ ہمیں اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ میرؔ کا غم، میرؔ کی تڑپ، میرؔ کا ہجر، میرؔ کی حسرتیں صرف میرؔ کی نہیں ہیں بلکہ پوری دنیا کو ان کے غموں میں اپنے غموں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ میرؔ نے سچ ہی تو کہا ہے۔

جو اس زور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

بے شک ہمسایہ کیسے سوئے گا۔ کیونکہ میرؔ کا رونا، میرؔ کا گریہ، میرؔ کی فریاد، میرؔ کی تڑپ ہے ہی کچھ اس طرح کی کہ ہمسایہ ان کی درد بھری آواز کو سن کر سو نہیں سکتا بلکہ وہ خود بھی رونے پر مجبور ہو جائے گا۔ یہ کمال ہے میرؔ کے منفرد انداز بیان کا کہ انھوں نے اپنے ذاتی غم میں آفاقیت کی شان پیدا کر دی ہے اور اپنے ذاتی غم کو غمِ کائناتی بنا دیا۔

میرؔ کی غزلوں میں نصیحت آموز اشعار کی بھی کمی نہیں ہے۔ انھوں نے بارہا اپنی غزلوں

میں دنیا کی بے ثباتی، خدا کی وحدانیت، انکساری کی عظمت اور غرور و گھمنڈ کی مذمت بڑے ہی پُر لطف انداز میں کی ہے، میرؔ بڑے خوددار انسان تھے۔ اپنی بے عزتی وہ قطعی برداشت نہیں کرتے تھے۔ ''جوش معرکۂ زیبا'' میں سعادت حسن خاں ناصر لکھنوی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ عماد الملک نواب غازی الدین خاں میرؔ سے کچھ ناراض ہو گئے انھوں نے میرؔ کو نیچا دکھانے کی غرض سے انہیں اپنے دولت خانہ پر طلب فرمایا۔ جب میرؔ تشریف لے گئے تو وہ کرسی پر بیٹھے لیکن میرؔ کے بیٹھنے کا کوئی انتظام نہ کیا۔ زمین پر سوائے خاک کوئی فرش بھی نہ بچھوایا۔ میرؔ صاحب نے تھوڑی دیر منتظر رہنے کے بعد اپنا دوپٹہ اتار کر زمین پر بچھایا اور اس پر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے جب میرؔ سے ان کا کلام سننے کی درخواست پیش کی تو میر تقی میرؔ نے یہ قطعہ پڑھ کر سنایا ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

اپنی توہین کا جواب اور اخلاقی درس دینے کا یہ عالمانہ اور ناصحانہ انداز میرؔ ہی کے بس کی بات تھی۔ اسی طرح کے چند اخلاقی اور نصیحت آموز اشعار اہل ذوق کے تسکین قلب کے لئے پیش کئے جاتے ہیں ؎

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

گزرا کسے جہاں میں خوشی سے تمام روز
کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میرؔ
دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت؟ اسباب لٹا راہ میں یاں ہم سفری کا

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دوکانِ شیشہ گر ہے

میرؔ کی زندگی کے حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ انھیں تا زیست آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے خودداری کا دامن ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑا۔ کسی نواب، امیر یا بادشاہ کی تعریف اس کی دولت یا خوشامد کی وجہ سے کبھی نہ کرتے تھے۔ میرؔ کو اپنی در بدری کا احساس بھی شدّت سے تھا۔ بچپن میں آگرے کی گلیاں قسمت نے ان سے چھین لیں اس کے بعد انھوں نے دلّی کو اپنا مسکن بنایا اور معاشی پریشانیوں کے باوجود بھی یہاں کی سکونت کو ترک نہ کیا لیکن جب نادر شاہ، احمد شاہ اور مرہٹوں کے پے در پے حملوں سے دلّی ویران و برباد ہوگئی اور وہاں مزید ٹھہرنا کسی بھی طرح مناسب اور باعث عافیت نہ سمجھ کر میرؔ نے دلّی کو بھی الوداع کہہ دیا اور لکھنؤ چلے آئے۔ جہاں نواب آصف الدولہ نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑے عزت و احترام کے ساتھ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ لکھنؤ میں جب میرؔ پہلی بار مشاعرے میں تشریف لے گئے تو کچھ لوگوں نے انہیں نہ پہچانا اور آپس میں سرگوشی کرنے لگے کہ یہ نو وارد کون ہے؟ میرؔ تھوڑے تنک مزاج تو تھے ہی

انھیں لوگوں کا یہ انداز اچھا نہ لگا۔ انھوں نے مشاعرے میں ہی اپنا ایک قطعہ پیش کر کے ان لوگوں کی باتوں کا منھ توڑ جواب اس طرح دیا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

آفریں صد آفریں۔ جواب دینے کا یہ شاعرانہ انداز، تعارف پیش کرنے کا یہ عالمانہ طریقہ کہ اپنی قابلیت اور صلاحیت کا لوہا پہلے ہی مشاعرے میں منوالیا۔

میرؔ نے دلّی کو خیر باد تو کر دیا لیکن دلّی سے جدا ہونے کا قلق انہیں زندگی بھر ستاتا رہا۔ انھوں نے دلی کی ویرانی، بربادی، خونریزی اور بدحالی کا ذکر اپنے کلام میں بار بار کیا ہے۔ مثلاً ؎

دل کی بربادی کا کیا مذکور ہے　　یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

دراصل یہ دل کی بربادی نہیں بلکہ دلّی شہر کی بربادی ہے۔ اسی قسم کے چند اشعار اور پیش کئے جاتے ہیں ؎

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے　　جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

بے یار شہر دل کا ویران ہو رہا ہے
دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے
اس منزل جہاں کے باشندے رفتنی ہیں　　ہر اک کے یاں سفر کا سامان ہو رہا ہے
اب کے بگڑے گی اگر ان سے تو اس شہر سے جا
کسی ویرانے میں تکیہ ہی لگا بیٹھیں گے

معرکہ گرم تو ٹک ہونے دو خوں ریزی کا
پہلے تلوار کے نیچے ہمیں جا بیٹھیں گے

خوار پھرایا گلیوں گلیوں، سر مارے دیواروں سے
کیا کیا ان نے سلوک کیے ہیں شہر کے عزّت داروں سے

یہ اشعار میرؔ کے فن اور ان کی قادر الکلامی کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں۔ میرؔ نے زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں سے خاص و عام سبھی کو روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی بحر شاعری کی تہہ میں انمول ہیرے جواہرات پوشیدہ ہیں۔ ضرورت ہے تو صرف غواص معنی کی، جو اس بحرِ نایاب میں غوطہ لگا کر درِ نایاب کو باہر لانے کی جسارت کر سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ میرؔ جیسا شیریں زبان، شکستہ دل اور خوددار شاعر اردو شاعری میں ملنا مشکل ہے۔ میرؔ کی خودداری، میرؔ کا دردوغم، میرؔ کی کڑھن، میرؔ کی کسک، میرؔ کے مصائب، میرؔ کی شیریں زبان اور میرؔ کا شکستہ دل اردو شاعری میں ضرب المثل ہے۔ میرؔ کی دوصد سالہ برسی پر میں انہیں عقیدت وقدر و وقار کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے میرؔ کے اس شعر کی تہہ دل سے تائید کرتی ہوں ؎

سنتے ہو ٹک سنو کہ پھر مجھ بعد
نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو.....

(پردہ کھلتا ہے)

کردار: (۱) میزبان۔ نام۔ مرنجان مرنج۔ ادھیڑ عمر

(۲) مہمان۔ نام۔ میرؔ۔ تقریباً ۶۰ سال

صوفے پر آمنے سامنے مہمان اور میزبان تشریف فرما ہیں۔

میزبان:۔ میں یعنی کہ میرانِ مرنج آپ کی ملاقات بادشاہِ غزل سے کراتا ہوں۔ ناظرین زوردار تالیوں سے اپنے مہمان کا استقبال کیجئے تالیوں کی آواز سے ہال گونج رہا ہے۔

مرنجان مرنج:۔ ہاں تو محترم قبلہ وکعبہ آپ اپنا تعارف خود کرادیں تو بہتر ہے.....معذرت خواہ ہوں.....خدانہ خواستہ کوئی بے ادبی ہوگئی تو.....

مہمان:۔ مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

م۔م:۔ اخاہ !دیکھا سامعین! آپ قبلہ وکعبہ ''خدائے سخن'' میرتقی میرؔ صاحب ہیں! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں.....ناظرین آپ کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں.....شاید آپکی وضع قطع.....

میرؔ:۔ کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

ڈاکٹر شہناز صبیح، ریڈر، الہ آباد ڈگری کالج، الہ آباد۔

م۔م:۔ ......ارے......ارے آپ تو رنجیدہ اور سنجیدہ دونوں ہو گئے......دیکھئے قبلہ دلی تو ہندوستان کے ایسے دل کی طرح ہے جو اجڑ کر پھر بستی ہے اور پہلے سے کئی گنا بہتر خوبصورت بن کر سجتی ہے آپ بالکل غم نہ کریں......یہ فانی کی دلی نہیں ہے۔

دل کا اجڑ نا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم

دل وہ نرالی بستی ہے جو بستے بستے بستی ہے

میرؔ:۔ ہاں ہاں کیوں نہیں......وہاں ہم جیسے شاعر جو بستے ہیں۔

جانے کا نہیں شور سخن میرؔ سے ہرگز

تا حشر جہاں میں میرا دیوان رہے گا

م۔م:۔ بالکل.....بالکل.....بجا فرمایا.....ایک بات گراں نہ گزرے تو ارشاد فرمائیں کہ آپ کے آنے سے قبل آپ کا کلام اتنی دور یعنی دلی سے لکھنؤ آ پہنچا وہ کیسے؟

میرؔ:۔ اگر چہ گوشہ گزیں ہوں شاعروں میں میرؔ

پہ میرے شور نے روئے زمیں تمام کیا

م۔م:۔ معاف کیجئے گا، آپ دربار شہنشاہی سے وابستہ کیوں نہ ہوئے کہ شہرت، دولت وعزت آپکے قدموں میں ہوتی......میرا مطلب ہے کہ قصیدہ گوئی کیوں نہ اپنائی؟

میرؔ:۔ مجھکو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں

میں جوں نسیم بادہ فروش چمن نہیں

م۔م: اوہ! لگتا ہے دہلی میں بڑی تکلیفیں اٹھا کر آپ مجبوراً یہاں تشریف لائے ہیں......شاید......گستاخی معاف! رہائش تکلیف دہ تھی؟

میرؔ:۔ گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے

سخت دل تنگ یوسف جاں ہے

چار دیواری سو جگہ سے خم

تر تنک ہو تو سو کھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی　　　آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

جا نہیں بیٹھنے کو مینھ کے بیچ　　　ہے چکش سے تمام ایواں کھینچ

م۔م:۔ آنسو پوچھتے ہوئے......بس کیجئے محترم......نہیں سنا جاتا......بس آپ کے دکھ کے دن کٹ گئے......اب آپ ''جس کو نہ دے مولا، اس کو دے آصف الدولہ'' کی پناہ میں آ گئے ہیں......قبلہ کچھ اپنے ایمان وعقائد کے متعلق ارشاد فرمائیں......

میر:۔ میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو ان نے تو

قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

کیسا کعبہ، کس کا قبلہ، کون حرم ہیں کیا احرام

اس کوچہ کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

م۔م:۔ :تو آپ صوفیوں کے جرگہ سے تعلق رکھتے ہیں......ایک بات دل میں آتی ہے......یہ عشق کچھ سکھاتا ہے یا بس ہوش وحواس سلب ہی کر لیا کرتا ہے؟

میر:۔ دور بیٹھا غبار میر اس سے

عشق بن یہ ادب نہیں آتا......

م۔م:۔ لوگ کہتے ہیں کہ عاشق مجنوں، دیوانہ ہوتا ہے لیکن ماشاء اللہ آپ تو بڑے وضعدار، سلیقہ مند دکھائی دے رہے ہیں؟ کیا سمجھا جائے......؟

میر:۔ (مسکرا کر)

سلیقہ شرط ہے ہر ایک امر میں　　　عیب کرنے کو بھی ہنر چاہئے

(آہ بھر کر)

میرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

م۔م:۔ گستاخی معاف کریں......آپ کا محبوب ہے کیسا؟ کوئی تصویر بنائی ہو آپ نے تو ہمیں بھی

دکھائیں..... دیکھئے ناظرین کیسے مشتاق نظر آرہے ہیں؟

میر:۔ میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں

ساری مستی شراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آوے

اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

م۔م:۔ اتنا نفیس، نازک اور خوبصورت ہے..... لیکن افسوس کہ وصال یار..... شاید آپ کو..... معاف کیجئے گا نصیب نہیں ہوا..... جب یاد بہت ستاتی ہے..... وہ کون سا موسم ہوتا ہے؟

میرؔ:۔ (بدبداتے ہوئے)

پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

(اونچی حسرتناک آواز میں)

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے

دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

م۔م:۔ ''صبا'' سے آپ کی دوستی ہے یا دشمنی؟ بڑے پیغام وسلام بھیجتے رہتے ہیں؟ کبھی پہنچایا بھی اس نے؟

میرؔ: (آہ بھر کر)

کبھی جائیو جو ادھر صبا تو یہ ان سے کہیو کہ بے وفا

وہی ایک میرؔ شکستہ پا، تیرے باغ تازہ میں خار تھا

م۔م:۔ بس اب یہ بتایئے کہ محبوب سے فی الحال آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟

میر:۔ ہمارے آگے تیرا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

م۔م:۔ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟ ایسے بے وفا محبوب سے دل لگایا ہی کیوں؟

میر۔ (خشونت بھری نظروں سے)

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پر رکھتے ہیں گناہ
ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے پیارے کیوں ہوئے

م۔م:۔ آپ کچھ زیادہ شرمیلے واقع ہوئے، مدعائے دل ٹھیک سے ظاہر کرتے تو ضرور مثبت نتیجہ ملتا؟

میر:۔ (ڈانٹنے کے انداز میں)

کہتے تھے کہ یوں کہتے، یوں کہتے اگر آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

م۔م:۔ اچھا بتائیں دنیا کی زندگی آپ کی نظر میں؟

میر:۔ کہا میں نے گل سے ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کے تبسم کیا .....

م۔م:۔ اچھا یہ دولت تو سنا تھا ہاتھ کا میل ہوتی ہے لیکن بادشاہت تو موروثی ہوا کرتی ہے، آپ کیا کہتے ہیں؟

میر:۔ نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

لو اور سنو

جس سر کو غرور آج ہے، یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

م۔م:۔ بادشاہ اور رعایا ظالم اور مظلوم کے دوسرے نام ہیں کیا؟

میر:۔ جب ظلم حد سے بڑھ جائے۔

شہاں کی کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھ میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

م۔م:۔ اگر آپ محبوب ہوتے تو عاشقوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے؟

میر:۔ (شرما کر)

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

م۔م:۔ ہمیں بندگی کیوں کرنا پڑتی ہے؟

میر:۔ سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا ہوتے دلِ بے مدعا ہوتے

م۔م:۔ میر صاحب اگر اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں.....آپ کی تنک مزاجی اور بد دماغی کے بڑے چرچے سنے ہیں آخر ایسا کیوں ہے؟

میر:۔ حالت تو یہ کہ مجھکو غموں سے نہیں فراغ
دل شورش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں میرا میر بے دماغ
از بس کے بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

م۔م:۔ ہاں۔ہاں۔

تیری چال ٹیڑھی تیری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

آپ کو معلوم ہے..... آپ کے زمانے کے بہت بعد بھی لوگ آپ کے کلام کے عاشق وفریفتہ رہے ہیں یہاں تک کے قلعہ معلی کی زینت یعنی استاد ذوقؔ..... ایوانِ غالب والے اسد اللہ غالبؔ، ناسخؔ اور اکیسویں صدی کے شاعر حسرتؔ بھی.....

میرؔ:۔ اچھا! مجھے یقین نہیں آتا کیا ثبوت ہے؟

م۔م:۔ لیجئے ان کے اشعار ملاحظہ کیجئے۔

نہ ہوا پر نہ ہو میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میرؔ نہیں

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میرؔ:۔ عاجزی سے۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنئے گا
کہتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنیے گا

پھر فخر سے۔

سارے عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

م۔م:۔ بس آخری سوال محترم یہ آجکل اپنے ہند میں دیر و حرم کے جھگڑے بہت بڑھ گئے ہیں..... آپ کے زمانے میں بھی کیا ایسا تھا؟

میرؔ:۔ نفی میں سر ہلا کر۔

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

بس بھائی بس ہم تھک گئے تمہارے سوالوں کے جواب دیتے دیتے.....(ناظرین سے مخاطب ہوکر) جاؤ بھئی جاؤ.....ہم کو نیند آرہی ہے.....سوجاتے ہیں.....

م۔م:۔ سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

پروڈکشن نوٹ:

صرف دو کرداروں کے مابین سوال وجواب کے ذریعہ پیش کیا جانے والا کم وقت میں اسٹیج کرنے کے خیال سے تحریر کیا گیا اسٹیج ڈرامہ ہے۔ میر کا کردار ادا کرنے والے کو بھرپور تاثر کے ساتھ اشعار پڑھنا ضروری ہے۔ اسٹیج کی تزئین پرانی وضع سے بھی ہوسکتی ہے اور نئے زمانے کے اعتبار سے بھی ہوسکتی ہے کیوں کہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ غالبؔ، اقبالؔ، انیسؔ، جگرؔ، فراقؔ، علی سردار جعفریؔ، شہریار وغیرہ وغیرہ شاعروں کی مقبولیت میرؔ پر قطعی اثر انداز نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کے لگائے ہوئے پودے ہی بعد کی نسلوں میں بارآور ہوئے ہیں۔ یعنی پرانے چراغ ہی نئے شمعدانوں میں لو دے رہے ہیں۔

اگرچہ گفتگو میز بان سے ہے لیکن دونوں کا رخ اسٹیج کی طرف ہو اور ناظرین سے تخاطب ظاہر ہو۔ ناظرین پوری دلچسپی سے یہ گفتگو سنیں اور درمیان میں آہ۔ واہ اور تالیوں سے اپنے ردعمل کا اظہار کریں۔

میرؔ بحیثیت مثنوی نگار

اردو ادب کے پورے سرمائے کا جائزہ لیا جائے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ادب اور عوامی مقبولیت نے عظمت کا تاج تین شاعروں کے سروں پر رکھا۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ۔ ان میں ''خدائے سخن'' کا لقب صرف میرؔ کے حصّہ میں آیا شخصی اعتبار سے زیادہ پسندیدہ نہ ہونے کے باوجود میرؔ کی شاعری میں ایسا جادو ہے جو کسی دلیل اور بحث کے بغیر دلوں پر اثر کرتا ہے۔ میرؔ کی شاعری اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اردو شعر و ادب میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ میر تقی میرؔ اصولاً ایک غزل گو شاعر تھے مگر انھوں نے قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، سلام، رباعیات، واسوخت وغیرہ اصناف پر بھی طبع آزمائی کی اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

میرؔ کی مثنویوں کی مجموعی تعداد بقول ڈاکٹر گیان چند جین ۳۷ ہے اور تین مثنویاں۔ جوان وعروس، در مبارکبادی کد خدائی بشن سنگھ پسر خورد راجہ ناگرمل اور مور نامہ ڈاکٹر گیان چند جین نے ہی تلاش کی ہیں۔ اور کلیات میرؔ میں ان کی تعداد کم و بیش ۳۹ کے قریب ہے ان میں بعض اتنی مختصر ہیں کہ ان کو مختصر واقعاتی نظمیں کہنا شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ البتہ قصوں والی مثنویاں نہ زیادہ طویل ہیں نہ ہی بہت مختصر ان کا طول و عرض میرؔ کے تصور قصّہ نگاری کے ہی مطابق ہے کیونکہ میرؔ کے تخلیقات شعری کی یہ خوبی رہی کہ وہ غزل میں عموماً طول کی طرف مائل ہو جاتے ہیں مگر مثنویات میں بیان کی طوالت سے گریز کرتے نظر آتے ہیں بعض دفعہ ان کی مختصر مثنویاں ان کی طویل غزلوں کے قریب جا پہنچتی ہیں اور ان کی عام غزلیات بعض اوقات مختصر مثنوی یا نظم کے تسلسل سے منظّم پائی جاتی ہے اس طول گوئی کا احساس میرؔ کو کس قدر تھا چند شعر میں ملاحظہ کریں۔

آج رہتی نہیں خامے کی زباں رکھئے معاف
حرف کا طول بھی جو مجھ سے گھٹایا نہ گیا

مسز زرینہ بیگم، لکچرر اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، الہ آباد۔

گو غزل ہو گئی قصیدہ سی　　عاشقوں کا ہے طول حرف شعار

عیب طول کلام مت کریو　　کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا

میرؔ کی مثنوی گوئی کے متعلق حالیؔ نے لکھا ہے کہ ''میرؔ نے غالباً سب سے اوّل چند عشقیہ قصّے لکھے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ دکنی ادب میں مثنویوں کی خاصی تعداد کے باوجود ان کے اجزاء میں تناسب کی کمی اور طرزِ بیان و زبان نامانوس ہے۔ میرؔ سے پہلے یا ان کے زمانے میں شمالی ہندوستان کی اردو مثنوی بھی اپنی خوبیوں کے اعتبار سے تعمیری دور کی مثنوی ہے اور اعلیٰ مثنوی نگاری کے لحاظ سے بہت سی خامیوں کا شکار ہے۔ اس نقطۂ نظر سے خود میرؔ بھی تعمیری دور کے مثنوی نگار ہیں اگر ہم انھیں بحیثیت مثنوی نگار عظیم شاعر نہ تسلیم کریں تو بھی جس طرح انھوں نے اپنے محدود دائرے میں مثنوی کے فن کو ترقی دی، اس میں حسنِ تناسب پیدا کیا، مضمون اور روحِ مضمون کے اعتبار سے جس سچّے جذبے سے روشناس کیا، پُر خلوص واقعیت کے ساتھ مثنوی کو غزل کی طرح شخصی جذبات کا ذریعۂ اظہار بنایا وہ قابلِ ستائش ہے۔

میرؔ کی مشہور مثنویاں اعجازِ عشق، شعلۂ عشق، دریائے عشق، معاملاتِ عشق، جوشِ عشق، خواب و خیال ہیں۔ ایک شکار نامہ دوسرے شکار نامے بھی اس کے قریب قریب سفر بر سات تو ۲۱۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ تمام مثنویاں اگرچہ اپنی ہیئت کے لحاظ سے مثنوی کا فارم اختیار کئے ہوئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ میرؔ کی چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ ان میں سے کچھ مثنویوں کے موضوعات بھی نظم کی ہی فضا قائم کرتے نظر آتے ہیں ہاں اگر ہم ان کی مثنوی نگاری کی ان ہیئتی حدود کا پابند نہ رکھ کر ان کے موضوعات کی روشنی میں تجزیہ کریں تو بہت حد تک یہ مطالعہ ایک تہذیبی مطالعہ بن جاتا اور اس کا میرؔ کے ساتھ اپنے عہد سے ایک گہرا تعلق ایک ذہنی رشتہ بھی قائم ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ میرؔ کا کمال فن بنیادی طور پر غزل میں ظاہر ہوا وہاں ان کی ذات رمز و کنایہ اور استعاروں کی زبان میں سامنے آئی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مثنویوں میں ان کی ذات کا زیادہ کھل کر انکشاف ہوا۔ میرؔ کے مزاج غزل کی چھاپ ان کی مثنویوں پر بھی طاری رہی اسی لئے میرؔ کی

مثنویاں دوسری اور مثنویوں سے مزاج میں مختلف ہیں۔ غزل کا یہی گہرا اثر میرؔ کی مثنویوں کی کمزوری بھی بنا اور طاقت بھی۔ کیونکہ میرؔ کسی بھی صنفِ سخن میں طبع آزمائی کر رہے ہوں وہ اپنے مزاج کے دائرے سے باہر نہیں جاتے جو انسانی فطرت بھی ہے اور یہی بات میرؔ کی مثنویوں کے ساتھ بھی خصوصاً عشقیہ مثنویات پر صادق آتی ہے۔ لوگوں کا یہ اعتراض کہ میرؔ کی مثنویاں صنفِ مثنوی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں شاید اس کی وجہ یہ غلط فہمی ہو کہ ہر مثنوی کوئی قصہ یا کہانی ہوتی ہے۔ میرے خیال میں مثنوی تو ایک فارم ہے اسے قصّے کے لئے استعمال ضرور کیا گیا لیکن اگر میرؔ نے اسے غزل کی طرح شدید شخصی احساسات و جذبات کا ذریعہ اظہار بنایا تو اس میں کوئی اعتراض کُن بات نہیں ہے۔ بھلے ہی وہ میرؔ حسن نہ بن سکے اور نہ ہی میرؔ حسن کی طرح خیالی افسانوی دنیا کی کہانیاں پیش کر سکے بلکہ اپنے ہی غمِ دل کے قصّے نظم کرتے گئے جس کی تہہ میں ان کا خلوص اور سچائی محسوس کی جا سکتی ہے۔

میرؔ کی مثنویوں کے قصّے اگرچہ معمولی، عام اور پُر الم و خوفناک ہیں مگر حقیقت اور فطرت کے قریب ہیں۔ ان کے پلاٹ، کردار نظم و ترتیب کے اعتبار سے ان خوبیوں سے خالی ضرور ہیں جو کسی قصّہ کو قصّہ بنانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں لیکن ان کے شخصی جذبات کی گہرائی اور درد انگیز اظہارِ فکر کی وجہ سے شاید ہم ان مثنویوں سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہ پاتے۔

مثنویاتِ میرؔ کا اگر ہم بطور منظومات ادبی و تہذیبی مطالعہ کریں تو ان سے بھی ہم میرؔ اور عہدِ میرؔ کی تہذیبی تفہیم میں بڑی مدد لے سکتے ہیں۔ کیونکہ میرؔ نے جہاں مثنویوں میں اور باتوں کا ذکر کیا ہے وہیں اپنے گھر کے حالات بھی بیان کئے جو میرؔ کی سوانح نامہ کا ایک حصّہ بن جاتا ہے جب وہ اس وقت کے شرفا پر آئی ہوئی آفت کا نمونہ اس طرح پیش کرتے ہیں۔

گٹھری کپڑوں کی میں اٹھائی تھی　　سر پہ بھائی کے چارپائی تھی
بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا　　اس کا سارا فگار کاندھا تھا
ساتھ کوئی چراغ لے نکلا　　کوئی سر پر اجاغ لے نکلا

یہ ایک چھوٹا سا متحرک تصویر نامہ جس میں اہلِ دہلی کے سر پر برسات کی بلا اور غریب غربا کا محدود اثاثہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے جس سے ہم میرؔ کی زندگی اور زمانے دونوں سے متعارف ہوتے ہیں۔

میرؔ کی بعض مثنویاں کتّے، بلّی، مرغ، بکری جیسے گھریلو جانوروں پر بھی ہیں جو ہماری زندگی کا آج بھی حصّہ ہیں جنھیں میرؔ نے اپنا موضوعِ فکر بنا کر ان کے کردار پیش کرنے میں انسانی کردار سے جو ان کی ترجیحات تھیں انھیں ظاہر کیا، مثنوی "در تعریف سگ و گربہ" کے چند اشعار دیکھئے۔

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں
دو ہیں قالب اور ان کی ایک ہے جاں
رنگ گربہ ہے شیر نر ہے داغ
آنکھیں اس کی اندھیرے گھر کا چراغ
کھائے نہ جو نہ ہو وہ سادۂ سگ بھوکا بیٹھا رہے قیامت لگ
کب مروت سے جائے کھانا چکھ
لڑے بھی ہے تو منھ پہ پنجہ رکھ

یوں تو عرف عام میں کتّے بلّی کی زندگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن میرؔ ان میں اخلاقی پہلو تلاش کرتے ہوئے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسانوں ہی کی طرح ان میں پاسداری کا جذبہ ہے، صلح و آشتی ہے وہ ایک دوسرے کے دوست نہیں دشمن ہیں مگر وہ ایک دوسرے سے چھین جھپٹ کا رویہ نہیں اپناتے جب تک انھیں وہ چیز نہ دی جائے۔ یہاں تک کہ بلّی جب لڑتی ہے تو منھ پر پنجہ رکھ لیتی ہے یعنی میرؔ یہاں قدیم مشرقی یا وسطی عہد کے مغربی قصّوں میں جانوروں کی زندگی سے جو اخلاقی تصور قائم کئے جاتے تھے ان کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

بُزنامہ یا بکرے سے متعلق مثنوی میں چھوٹے چھوٹے معصوم بچّے پھاہے سے دودھ پی کر بڑے ہوئے اور جب انہیں قربان کرنے کا وقت آیا تو میرؔ کی رحم دلی اور اس معاشرے کا احوال

جہاں اپنے ہاتھوں پال کر قربان کرنا کتنی بڑی بات سمجھی جاتی تھی جس میں ہزاروں برس کی روایت کا عکس نظر آتا ہے کس طرح پیش کرتے ہیں ؎

پاس جانا ان کے اب مسدود ہے ذبح کرنے کو ہر اک موجود ہے
اس ادا سے جائیں گے چھریوں تلے کاش کہ ہوتے نہ ہاتھوں میں پلے

گھر میں پلے ان بے زبانوں کے انفرادی کردار میرؔ کو ذہنی طور پر کتنا متاثر کرتے ہیں اور کیا اخلاقی مرقعے ان کے ذہنی سطح پر ابھرتے ہیں اس کے بھی نقاش ہیں۔

میرؔ نے اپنے گھر کے ایک مرغ کی وفات پر جو مثنوی کے فارم میں مرثیہ لکھا وہ مرغ ایک مرغ نہ رہکر کردار کی شکل میں جس حوصلہ مندی، خود اعتمادی کا انداز لئے ہوئے ظاہر ہوتا ہے وہ میرؔ کے زمانے اور ذہن کے مطالعے کی تشکیل کرتا ہے جس کے ذریعہ میرؔ نے اس عہد کے کسی اعلیٰ کردار، شریف مزاج زندگی کی مرقع کشی کی ہے اور جتایا ہے کہ اچھے اور بلند کردار ہمیشہ غیر معمولی ہوتے ہیں ؎

ہے مرغ چمن میں جہاں کے ایسا آج برنگ کلہ تاج خروس سر پر تاج
جھکا جو خاک کی جانب کو کیسی بیجاں کا زمیں پہ تاج گرا ہدہدِ سلیماں کا
ہوا کے مرغ ہوئے داغ اس کے ماتم سے سیاہ پوش رہے طائرِ حرم غم سے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مرغ کا غم نامہ اس عہد کے کسی تاریخی واقعات کی کڑی ہے جسے میرؔ فراموش نہ کر سکے اور مرغ کو علامت بنا کر اپنے جذبات اس طرح پیش کئے جو کوئی صاحبِ شعور ہی کر سکتا ہے۔

میرؔ نے لکھنؤ کی مرغ بازی کا تماشا بہت قریب سے دیکھا تھا مرغ لڑانے والوں کی تصویر کشی اپنی مثنوی میں اس طرح کرتے ہیں ؎

جمعہ منگل کو پانی کی ہے دھوم گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش

مرغ لڑتے ہیں ایک دولاتیں　　سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے پہ پھڑکنے لگے　　ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج　　ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج

دلّی میں بھی بندر، ریچھ اور لنگور کا تماشہ دیکھنے کو ملتا تھا یہ اور بات ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا کب ان سے کیا رشتہ رہا وہ دور جہاں مستقل اور مسلسل نبرد آزمائی سے انسان کا سکون درہم برہم ہو رہا تھا، انسانی اقدار پامال ہو رہے تھے وہاں میرؔ کا جانوروں کی زندگی دریافت کرنا شاید تہذیبی خلا کو ذہنی طور پر بھرنے کی ایک چھوٹی سی خوبصورت کوشش رہی ہوگی۔

میرؔ نے جگہ جگہ اپنے اشعار میں تہذیبی قدروں کے زوال کی طرف اشارہ کیا ہے اسے شدت سے محسوس کیا بھلے ہی لوگ انھیں بد دماغ کہیں یا کچھ اور لیکن جب ایک حساس شاعر جن قدروں سے محبت رکھتا ہو انھیں اپنی آنکھوں سے لٹتے پامال ہوتے دیکھتا ہے تو اسے دکھ ہونا لازمی ہے جو شاید اس کی بے رخی اور بد دماغی کی وجہ بن جاتا ہے۔ یہی میرؔ کے ساتھ بھی ہوا۔ میرؔ نے جانوروں کے حوالے سے جو منظر نامے پیش کئے ان میں شکار نامے قابلِ دید اور قابلِ داد ہیں ان کے شکاریوں کے پاس صرف ہتھیار ہی نہیں بلکہ پلے اور سدھے ہوئے شکاری جانور بھی ہوتے ہیں۔ چیتل، پاڑے، کوڑخر، سانبھر، ہرن اور ہاتھیوں کا شکار کرنے کے لئے سدھے ہوئے ہاتھی زندہ گرفتار کئے جاتے ہیں لیکن میرؔ نے ہاتھی کا سر کاٹنے کا بھی بیان کیا ہے۔ شکار کئے جانے والے جانوروں میں ریچھ کا بھی ذکر شامل ہے جو صرف جنگجویانہ فطرت کا اظہار ہے ورنہ ریچھ کا گوشت اور کھال دونوں ہی بیکار ہوتے ہیں۔ غرض کہ ہم میرؔ کے شکار ناموں کے ذریعہ ماضی کی ان سرگرمیوں سے واقف ہوتے ہیں جن کے لئے اب نہ اس طرح کے جنگل ہیں اور وہ نہ جنگلی جانور۔

میرؔ نے بڑی بڑی جھیل اور تالابوں کے کنارے شکاری لشکر کا مچھلیوں پر جال پھینکا جانا جس کے نتیجے میں تالاب مچھلیوں، کیکڑوں، کچھوؤں سے خالی ہو جاتے تھے۔ کچھ آبی پرندے

جنھیں شکاری اپنا نشانہ بنا ختم کر دیتے تھے اس کا بھی ذکر کیا ہے ؎

نہ چیتل نہ پاڑھا نہ ارنا نہ شیر
ہوئے گولیاں کھا کے یک لخت ڈھیر

لگی پڑنے بجلی سی تیغِ سیاہ — پریشان ہو جیسے ابرِ سیاہ
نہایت وہ ہاتھی ہوا لخت لخت — گرا یوں کہ جیوں پارۂ کوہ سخت

دکھالا کے لشکر میں اثنائے راہ
سر اس کا کٹا جیسے برجِ سیاہ

میرؔ نے جس طرح جانوروں سے اپنی محبّت، جنگلوں کی تصویریں، شکار کے نقشے، جانوروں کی حرکات وسکنات، شکار کی گہما گہمی پیش کی وہ ان کی عشقیہ مثنویوں کے بعد ایک الگ رنگ کا مظاہرہ کرتی ہیں اور یہاں میرؔ زندگی سے بھی لطف لیتے واقعاتی نظر سے مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک نشاطیہ رنگ ہے جو میرؔ کے متعلق نیا تجربہ تھا ان مثنویوں میں آصف الدولہ کی مدح سرائی بھی ہے۔ شکار نامے لکھ کر شہرت حاصل کرنے کی تمنا بھی۔ جس کے ذریعہ میرؔ فردوسیؔ کا مقام پالینے کے خواہش مند نظر آتے ہیں ؎

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ — امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ
کسو سے ہوئی شاہنامے کی فکر — کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر
کیا شہ جہاں نام کہہ کر کلیم — دلِ شاعراں رشک سے ہے دو نیم

لیکن چند اشعار کے بعد ہی ان کی ذہنی کیفیت بدلتی نظر آتی ہے اور وہ اس طرح مخاطب ہوتے ہیں ؎

بہت کچھ کہا ہے کرو میرؔ بس — کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا — خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو — بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو
پئے آصف الدولہ میں نے بھی میرؔ — کہے صید نامے بہت بے نظیر

مگر نام نامی یہ مشہور ہو　　گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو

موسمِ برسات میں اپنے تکلیف دہ سفر کا ذکر بڑے ہی موثر انداز میں ''نسنگ نامہ'' میں کیا اس مثنوی میں اس دور کے معاشرتی و معاشی حالات قصبوں و شہروں میں سفر کے طریقے عام لوگوں کی زندگی اس دور کی معاشرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اس سفر کو میرؔ نے ایک سانحہ کہا ہے۔

جب کہ کشتی رواں ہوئی واں سے　　جسم گویا کہ تھا نہ تھی جاں سے

ریلا پانی کا جب کہ آتا تھا　　خوف سے جی بھی ڈوبا جاتا تھا

بہتا پھرتا تھا خضر کشتی پاس　　غوطے کھاتے تھے حضرتِ الیاس

اس مثنوی میں غازی آباد، میرٹھ، بیگم آباد شاہ درنا وغیرہ کا بھی ذکر آیا ہے جو دلّی سے قریب کے علاقے ہیں گویا یہ مثنوی شاہ عالم ثانی کے دورِ حکومت میں لکھی گئی معلوم ہوتی ہے جب میرؔ دہلی میں قیام پذیر تھے لہٰذا جن جگہوں کا نقشہ انھوں نے کھینچا ہے اس سے پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ کہیں کہیں ایسا طنز بھی کیا ہے جس سے بیان اور بھی موثر ہو گیا ہے۔ جیسے

ماش کی دال کا نہ کریئے گلا　　گوشت یاں ہے کبھو کسو کو ملا

جو کچھ آیا سو کھا لیا میں نے　　کچھ رہا سو اٹھا دیا میں نے

ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے　　چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے

سو تو نکلے ہو کورے بالم تم　　ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

لیکن ان سبھی مثنویوں میں انھوں نے عام زبان کی تخلیقی سطح پر استعمال کر کے نہ صرف اس میں ادبیت پیدا کی بلکہ اپنے گہرے مشاہدے اور قوتِ اظہار میں بھی غیر معمولی اضافہ کر دیا جو اس دور کے کسی شاعر نے اس طور پر شاید نہیں کیا تھا۔

میرؔ کے دور کے تہذیبی تصورات اور آئیڈیا لزم کو ہم خصوصیت کے ساتھ ان کی عشقیہ مثنویوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کی تعداد تقریباً ۹ یا کچھ ناقدین کے قریب ۷ ہے۔ ان میں ۳۔ خواب و خیال، جوشِ عشق، معاملات عشق میں آپ بیتی بیان کی گئی ہے۔ لیکن جن مثنویوں میں

جگ بیتی ہے وہاں بھی میرؔ کی شخصیت، ان کے تجربات واضح طور پر موجود ہیں۔ مثنوی ''خواب و خیال'' میں جہاں انھیں چاند میں اپنی محبوبہ کی شکل نظر آتی ہے وہاں یہ صرف عشقیہ قصہ نہیں رہ جاتا بلکہ اس کے پس منظر میں اس دور زندگی کے تہذیبی آئیڈیل کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے جہاں میرؔ اپنے تصورات محبت کے ذریعہ خاص تمہید پیش کرتے ہیں جو کسی واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے بہت اہمیت رکھتی ہے ''شعلۂ شوق'' کے اشعار دیکھئے ۔

محبت نے ظلمت کا کاڑھا ہے نور　　نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

محبت سے ہے انتقام جہاں　　محبت سے گردش میں ہے آسماں

عشق و محبت کا یہ تصور فلسفیانہ یا پھر صوفیانہ ہے۔ جسے کہیں کہیں میرؔ نے اس درجہ پہونچا دیا ہے ۔

کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی

کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

جو اس دور تہذیب کی صوفیانہ روح کو سمجھنے میں مددگار ہیں ''شعلۂ شوق'' کے شروع میں میرؔ نے عشق کی اہمیت اور تصور کو پیش کیا ہے اس کے بعد قصّے کا آغاز کرتے ہیں۔ یہاں قصہ اتنا اہم نہیں جتنا اس کا انجام قابل توجہ ہے اس کی ہروئین ایک ہندو عورت ہے جو اپنے شوہر پرس رام سے بے پناہ محبت کرتی ہے لیکن وہ جب کسی سے پرس رام کے مرنے کی خبر سنتی ہے تو ایک لمحہ بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کر پاتی اور ختم ہو جاتی ہے۔ یہ سانحہ پرس رام کو معلوم ہوتا ہے تو وہ بے خود، بدحواس آتا ہے اور پیکر مردہ کے پاس گر جاتا ہے۔ اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اضطراب کے عالم میں وہ بھی مجنوں ہو جاتا ہے آخر کار موقعۂ واردات پر ایک شعلہ بلند ہوتا ہے جو پرس رام کو آواز دیتا ہے وہ اس شعلہ سے ہم آغوش ہو کر ختم ہو جاتا ہے پھر اس کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ عورت کی وفاداری اور جاں سپاری کا یہ واقعہ جہاں اس کی وفا کو آزمانے کے لئے مرنے کی جھوٹی خبر دی گئی تھی اس عشقیہ قصے کا آئیڈیل ہے اور میرؔ کے اس نظریہ کا بھی پتہ دیتا ہے کہ میرؔ اس بات کے قائل ہیں کہ عشق کی آگ سب سے بڑی حقیقت ہے اور وہی محبت کو دوام بخشتی ہے

اسی آگ کے وسیلے سے عاشق و معشوق امر ہو جاتے ہیں۔ مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پکارا کہاں ہے پرس رام تو　　محبت کا ٹک دیکھو انجام تو

پرس رام اس آواز پر کہتا ہے ؎

کہ میں ہوں پرس رام خانہ خراب　　مرا دل بھی اس آگ سے ہے کباب

مثنوی کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے ؎

بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے　　بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے

فسانوں سے اس کے لبالب ہے دہر　　جلائے ہیں اس تند آتش نے شہر

اس مثنوی میں نہ صرف جذبات نگاری اثر انگیز ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خود میر کے جذبات عشق بھی اس میں پیوست ہیں۔ تہذیبی مطالعہ کے پیشِ نظر یہاں لڑکی پہلے ہلاک ہوتی ہے اور وفاداری کے امتحان میں پوری اترتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس معاملے میں میر پنجاب و پراکرت کے تصور عشق کے بعض قصوں سے اثر پذیر ہوئے ہوں جہاں عورت جاں نثاری، قربانی کے اعتبار سے بڑے عشقیہ کردار کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے کیونکہ فارسی، عربی، سنسکرت اور اردو میں عورت محبوب ہے اس کے یہاں ایک طرح کا جذبہ سپردگی ملتا ہے مگر عشق میں جاں نثاری مرد کے حصّے میں آتی ہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ میر نے اس قصہ کو اپنے ماحول سے ماخوذ کیا تھا بہر حال یہ ضرور ہے کہ اس طرح کے واقعات کا رشتہ کہیں نہ کہیں اس وقت کی زندگی اور عشق کے انجام کی نشان دہی کرتا ہے۔

میر کی دوسری مشہور و معروف مثنوی ''دریائے عشق'' ہے جس میں کوئی مافوق الفطرت عناصر موجود نہیں۔ میر کی نمائندہ مثنوی میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس میں بھی شروع میں تصور عشق پر روشنی ڈالی ہے گویا دنیا کا سارا نظام عشق کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ جس طرح شعلۂ عشق میں مرنے والی ہیروئن کو از راہِ امتحان غلط خبر سنا کر فریب دینے کا کام ایک چالاک آدمی نے کیا تھا یہاں ایک دایہ یہی کردار ادا کرتی ہے۔ اس دور میں کٹنیوں کا بھی بڑا اہم رول ہوا کرتا تھا۔ دایہ نے

اس کٹنی کا کردار ادا کیا ہے قصہ سیدھا سادا ہے ایک نوجوان کسی پردہ نشین پر عاشق ہو گیا اور دیوانہ پن میں اس کی حالت اس زمانے کے تصور عشق کے مطابق مجنون سی ہو گئی اس عشق کی وجہ سے لڑکی کے عزیزوں کو بدنامی کا خوف ہوا یہ ردّعمل جو اس دور کے درمیانہ طبقہ کا انداز نظر تھا بدنامی رسوائی کے خوف سے پہلے مارنے کا منصوبہ بنایا پھر دایہ کے ساتھ اپنی بیٹی کو محافہ میں روانہ کر دیا راستے میں دریا کے کنارے اس کا عاشق جو پیچھا کرتا چلا آیا تھا دایہ نے لڑکی کی جوتی دریا میں بہا کر کہا کہ تو اگر سچا عاشق ہے تو اسے دریا سے نکال ۔ یہ آزمائش عشق جو الف لیلائی قصہ سے لیکر آج تک کے قصّوں میں ہمیں نظر آتی ہے ۔ جیسے ہی ہیر و دریا میں جاتا ہے موت کے حوالے ہو جاتا ہے کچھ دنوں بعد لڑکی واپس اپنے شہر آنے لگتی ہے تو دایہ سے وہ دریا کی جگہ دریافت کرتی ہے جہاں اس کا عاشق غرقاب ہوا تھا اور دھوکے سے کود جاتی ہے وہ بھی ختم ہو جاتی ہے ۔ غوطہ خور جب ان کی نعش کو باہر لاتے ہیں تو دونوں ہم آغوش پائے جاتے ہیں قصہ اسی المیۂ وصل پر ختم ہوتا ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ کریں ۔

عاشق اس کا کسو کا جان گئے　　سب برا اس ادا کو مان گئے
کیونکہ باہم معاش تھی سب کی　　یک جا بود و باش تھی سب کی
مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں　　دفعتاً اس بلا کے تئیں ڈالیں

تجھ کو آیا نظر کہاں آ کر　　پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جا کر
مجھ کو دیجو نشان اس جا کا　　میں بھی دیکھوں خروش دریا کا

نکلے باہم موئے و لے نکلے　　دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا　　مر گئے پھر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں　　ایک کے لب سے ایک کو تسکیں

جونظر ان کو آن کرتے تھے　　ایک قالب گمان کرتے تھے

میرؔ کی یہ مثنوی فنِ شاعری کے لحاظ سے اردو زبان کی بہترین مثنویوں میں سے ایک ہے بعد میں یہ اتنی مشہور ہوئی کہ مصحفیؔ نے اسی قصہ کو اپنی مثنوی ''بحرالمحبت'' کا موضوع بنایا۔

میرؔ نے معاملاتِ عشق، جوشِ عشق، اعجازِ عشق، حکایتِ عشق، مورنامہ وغیرہ مثنویات میں عشق کو ہی موضوعِ سخن بنایا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گویا عشق زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ ان کے یہاں عشق ایک بے حد وسیع مفہوم رکھتا ہے، ایک ایسا ابدی جذبہ ہے جو نظام کائنات، انسان اور خدا کے مابین بنیادی رشتہ قائم کرتا ہے جس کی زندگی و کائنات میں بڑی اہمیت ہے۔ میرؔ کے یہاں عشق کا تصور ویسا ہے جیسا اقبالؔ کے یہاں فلسفۂ حیات بن کر زمانے میں مقبول ہوا۔ اقبالؔ کا عشق کوہساروں کو اپنے کاندھوں پر اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ عشق دمِ جبرئیل، دلِ مصطفےٰ ہے تو میرؔ کے یہاں عشق ایک بحرِ بے کنار جو ساری زندگی پر غالب ہے۔

محبت ہی اس کارخانے میں ہے　　محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

محبت سے ہے انتظامِ جہاں
محبت سے گردش میں ہے آسماں

اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں　　یہی ذرّے کی جان نومید میں

(شعلۂ شوق)

کچھ حقیقت نہ پوچھ کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق

عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ
عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ

عشق تھا جو رسول ہو آیا
ان نے پیغامِ عشق پہونچایا

عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

میر کی عشقیہ مثنویوں اور کرداروں کے طرزِ عمل کو عشق کے اسی تصور کی روشنی میں دیکھنا ہوگا تبھی ہم ان کی گہرائی کو سمجھ سکیں گے۔ کیونکہ میرؔ کو بنیادی طور پر قصّے نہیں بلکہ اس مخصوص تصور عشق کو شعر کا رنگ دینے میں دلچسپی تھی۔ ان کے یہاں عشق مادی، روحانی، مجازی و حقیقی سطح پر مل کر ایک وحدت بن گیا ہے۔ میرؔ انسانی اقدار کی برگزیدگی کے لئے عشق کو بطور اصلاح استعمال کرتے ہیں اسے اشرف المخلوقات کی معراج تصور کرتے ہیں۔

میرؔ کی مثنویات کے تہذیبی مطالعہ کے تحت ان کی ہولی پر لکھی دو مختصر مثنویوں کا اگر جائزہ لیں تو ایک نئے منظر نامے کا انکشاف ہوتا ہے وہ یہ کہ لوگ اس موقع پر صرف رنگ ہی نہیں کھیلتے تھے بلکہ چراغاں بھی کرتے تھے۔ اس وقت کی شہری تہذیب میں سب مل جل کر تہوار مناتے۔ جس کا ذکر میرؔ نے جشنِ نوروز کہہ کر کیا ہے ۔

روشن الدولہ نے کی تھی روشنی　　کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی
وہ چراغاں گرچہ تھے دربار تک　　تھے تماشائی گدا و شاہ تک
راہ میں تر پولئے مینار تھے　　روشنی کے کوچہ و بازار تھے

نیز آتش بازی کے فن کا مظاہرہ ہوتا، اربابِ نشاط کی چوکیاں نکلتیں۔ اہل فرنگ بھی اس آتش بازی کی تیاری میں حصّہ لیتے تھے ۔ جس کا میرؔ نے خاص ذکر کیا ہے

نذر کو نواب کی اہل فرنگ　　لے کے آتش بازی آئے رنگ رنگ
عرصہ گلریزی سے گلشن ہو گیا　　چرخ ان تاروں سے روشن ہو گیا

میرؔ کے یہاں ہجویہ مثنویاں بھی موجود ہیں جو دراصل طنزیہ اور احتجاجی ہیں ان کو بھی ہم تین حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ ایسی مثنویاں جس میں افراد کے بارے میں میرؔ نے لکھا۔

۲۔ دوسری وہ جس میں اپنے حالات اور حالاتِ زمانہ کو ہدفِ ملامت بنایا۔

۳۔ ایسے اشعار جن میں اقدار، موسم اور دنیا پر طنز کے تیر برسائے۔

ان مثنویات سے اس دور کی اخلاقی، معاشی، انتظامی، فوجی نظام کی تباہی کا پتہ چلتا ہے اور دلّی کی افلاس خستہ حالی کا اندازہ ہوتا ہے جس سے میرؔ دوچار تھے۔ ایک جگہ میرؔ نے کس طرح افراد کو غصہ کا طنز کا نشانہ بنایا ہے لیکن انھیں اس وقت بھی یہ احساس ہے کہ ہجو گوئی ان کا شعار نہیں ہے ؎

میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار — کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
گر کنھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا — ہجو اس کی ہو گئی اس کا کہا
تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا — درد مند و عاشق و دل ریش تھا
پر کروں کیا لا علاجی سی ہے اب — غصہ کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تب

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال — اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے — سخت دل تنگ یوسفِ جاں ہے
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی — آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
دب کے مرنا ہمیشہ مدِ نظر — گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر

کیا کہوں اب کی کیسی ہے برسات — جوشِ باراں سے بہہ گئی ہے بات
بوند تھمتی نہیں ہے اب کی سال — چرخ گویا ہے آب درغر بال
وہی یکساں اندھیر برسے ہے — آسماں چشم وا کو ترسے ہے
لکھے کیا میرؔ مینہ کی طغیانی — ہو گئی ہے سیاہی بھی پانی
میرؔ خطاط یک قلم دیکھے — لیکن آغا سے لوگ کم دیکھے
یعنی عبد الرشید تھا استاد — خوشنویسی کی جن نے دی ہے داد

خط کی خوبی کا اس کے اب تک ڈھنگ　　صفحۂ روزگار پر ہے رنگ
خط میں کیسا ہی کوئی کامل ہو　　اس کا کب نقطۂ مقابل ہو

ان مثنویوں کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں ان میں میرؔ کا عہد ان کی ذہنی زندگی مختلف اعتبار سے جھلکتی نظر آتی ہے بھلے ہی فنی نقطۂ نظر سے نقاد میرؔ کی مثنویوں میں عیب کشائی کرتے ہوں لیکن میرؔ نے جس طرح اپنے زورِ قلم سے مثنوی میں مافوق الفطری واقعات کو فطری انداز، جذبۂ عشق، تغزل کی چاشنی اور موتی پرونے والی دلکش عام فہم زبان سے لبریز کیا جن سے ان کی غزلیں متصف ہیں۔ جو سوز و گداز پر مشتمل جذبات نگاری اور والہانہ سرمستی پیدا کی وہ ان کی عظمت کا اعتراف کرانے کے لئے کافی ہے۔ جہاں وہ اپنے کمالِ فن کے ساتھ زندہ جاوید ہو جاتے ہیں بقول ڈاکٹر سید عبداللہ کے حوالے سے میں اس مضمون کو اختتام دینا چاہوں گی۔

''میرؔ کی عام مثنویاں اچھی مثنویاں ہیں ان کی زبان بھی میر حسنؔ کی زبان کے مقابلے نا صاف اور غیر ہموار ہے۔۔۔۔۔ان کا طرزِ بیان، نظم و انتظام بھی مثنویت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا بایں ہمہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے مثنوی نگاری کی تحریک کو بڑی ترقی دی۔ ان کے گنگا جمنی رومانوں اور آپ بیتیوں نے ان کے دور کو بہت متاثر کیا۔ خصوصاً 'آب و آتش' کی ٹریجڈی کا گہرا نقش اس دور کی شاعری میں ملتا ہے۔ ان کے بعد بسمل فیض آبادی اور مصحفی ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔۔۔۔۔ان وجوہ و اسباب کی بنا پر ادب اردو کا ہر مورّخ میرؔ کو مثنوی کے معماروں میں اہم جگہ دینے پر مجبور ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد کی ہم نوائی میں ہم یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہیں کہ۔'' جو اصول مثنوی کے ہیں وہ میرؔ صاحب کا قدرتی انداز واقع ہوا ہے'' !''

(بحوالہ میرؔ کی مثنوی نگاری از سید عبداللہ، افکار میرؔ ۔ص ۲۵۸)

اب تو بھی قلم رکھ دے اے میرؔ ستم دیدہ

خدائے سخن میر تقی میرؔ کا عہد (1810-17[illegible]) ہندوستان کی تاریخ کا اہم باب ہے۔ایک طرف یہ دور عظیم الشان مغلیہ حکومت کے تنزل کی داستان ہے جس عہد میں مغل بادشاہوں کا رعب اور حکومتِ عملی جاتی رہی تھی۔ دربار میں عیش وطرب کی محفلیں سرگرم تھیں۔مرکزی حکومت میں اندرونی اختلاف ،خانہ جنگیاں اور سازشیں عروج پر تھیں ۔امراء بادشاہ گر کی حیثیت اختیار کررہے تھے اور خود مختار ریاستوں کو قائم کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جارہے تھے۔جاٹوں ،روہیلوں اور مرہٹوں کی سرکشیاں زوال کی رفتار کو تیز کررہی تھیں ۔ایران کے بادشاہ نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں نے مغلیہ سلطنت کی کمزور عمارت پر المناک ضرب کاری کی تھی ۔بیرونی طاقتوں نے اس کا فائدہ اٹھا کر اپنے قدم مستحکم کرنے کی کاوش سرگرم کردی تھیں ۔انگریزوں کی چیرہ دستیاں بھی وجود میں آگئی تھیں۔دوسری طرف اس سیاسی واقتصادی زوال اور معاشی انحطاط کے دور میں اردو کے شاعر ولی دکنی کی دلّی آمد کے وقت سے اردو ادب کی شمالی ہند میں نشوونما ہورہی تھی اس وقت تک فائزؔ،حاتمؔ،میرؔ جیسے شاعروں نے اردوادب میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی بھی تصویر کشی کی اور حادثاتِ وقت کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ کیونکہ کوئی بھی ادب قوموں کے عروج وزوال کا آئینہ ہوتا ہے۔اس دور کے اہم رکن میر تقی میرؔ جیسے نازک شاعر حالات کے تندوتیز طوفانوں اور ستموں کے عینی شاہد تھے،جنھوں نے انکے ذہن کو منتشر کردیا تھا اوران کی شعری صلاحیتوں کو مصائب والم کے نشتروں نے نئی جہت اور انفرادیت بخشی تھی۔اسی لئے ان کی آپ بیتی میں جگ بیتی کے نقوش عیاں ہوتے ہیں اور کلام خصوصاً غزلوں، مخمس، مثنوی اور شہر آشوب اور دیگر اصنافِ سخن میں عمیق مشاہدات جس شعری انداز سے نمایاں ہوتے ہیں وہ نہ صرف اردو ادب بلکہ تاریخی اعتبار سے بھی

ڈاکٹر یوسفہ نفیس، ریڈر،شعبۂ تاریخ، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج ،الہ آباد

ناقابلِ فراموش ہیں۔ بقول شاعر۔

مجھکو شاعر نہ کہو میرؔ کے صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

حالانکہ میرؔ داخلیت پسند ہیں لیکن خارجی ماحول کی سرگرمیاں انھیں خاموش نہیں رکھ سکیں۔

ضبط کروں میں کب تک آہ
چل اے خامے بسم اللہ

میر تقی میرؔ کے والد درویش تھے۔ درویشوں اور بزگوں کی محبت نے میرؔ کو شدید حساس ذہن دیا۔ اس لئے دہلی کی تباہی، معاصر حالات، ذاتی پریشانیوں اور معیشت کی فکر سے ان کی شاعری غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی تائید اُن کے تمام اشعار سے ہوتی ہے۔

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ میرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہے

دل سر بسر خراب ہے تعمیر کیا کروں — آشفتگیٔ حال کی تعبیر کیا کروں
خوں نابہائے چشم کی تقریر کیا کروں — زردیِ رنگ چہرے کی تحریر کیا کروں

آیا جو میں چمن میں خزاں ہو گئی بہار

ناسازگار زمانے کی رفتار کی وجہ سے میرؔ کو خوب دریافت کر لینے پر بھی، وقتِ خوش، محض 'نکہتِ گل' کے مانند نظر آتا تھا۔ میرؔ حضرت محمد ﷺ کو درود وسلام بھیجتے ہیں تو بھی اُن کے دل میں زمانے کے کرب کی گہرائیاں نظر آتی ہیں۔

واہ رے اسلام و دیں سبط محمد سے کیں
قتل بھی پھر قتلِ عام تجھ پہ درود وسلام

اب کہے سو کیا کہے میرؔ زمانہ زدہ
روز و شب و صبح و شام تجھ پہ درود وسلام

میرؔ کے کلام اور ان کی آپ بیتی میں سیاسی بحران کے اشارات ملتے ہیں۔ اگر ان کو تاریخی حقائق کے ضمن میں دیکھا جائے تو ان کی پوشیدہ اصلیت سامنے آتی ہے۔ مغل بادشاہ، وزیر، امرا، سپاہی اور حکام کی حالت پُر آشوب تھی۔ میرؔ نے اپنی آپ بیتی میں محمد شاہ، احمد شاہ، عالمگیر دوئم اور شاہ عالم دوئم کی ناگفتہ بہ حالات کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اورنگ زیب کے بعد سے بہادر شاہ اوّل، جہاندار شاہ فرخ سیر کے وقت سے ہی خدا کا پرتو سمجھا جانے والا بادشاہت کا تصور تنزّل پذیر تھا۔ تاج کی عزّت و حرمت نیست و نابود ہو رہی تھی۔ فرخ سیر کو سید برادران نے اپنے اقتدار میں رکھا۔ محمد شاہ بادشاہت کے عہدے کی عزّت افزائی کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔ اس کے وقت میں 1739ء میں نادر شاہ کے حملے نے سلطنت کی جڑوں کو اور کمزور کر دیا۔ احمد شاہ کو جاوید خاں کو اختیارات دینے کے لئے مجبور ہونا پڑا اور عالمگیر دوئم عماد الملک کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بنا رہا۔ میرؔ نے اپنی نظروں سے احمد شاہ کو اندھا ہوتے، عالمگیر ثانی کے دھوکے سے قتل ہوتے دیکھا اور غلام قادر روہیلا کے نوکِ خنجر سے شاہ عالم کی آنکھیں نکالے جانے کے سانحہ سے بھی واقف رہے۔ اس لئے ان کے قلم سے اشعار سامنے آئے۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک پہ سب زیر نگیں تھا

بٹھلا دیا فلک نے ہمیں نقشِ پا کے رنگ
اٹھنا ہمارا خاک سے ہے اب خدا کے ہاتھ

ہمارے دیکھتے زیر نگیں تھا ملک سب جن کے
کوئی اب نام بھی لیتا نہیں ان ملک گیروں کا

سو تو نکلے ہو کورے بالم تم ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
یک سر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پر غرور تھا

ان اشعار کی معنویت کا اندازہ، چہار گلزار میں ہرچرن داس کے محمد شاہ کے وقت سے لے کر شاہ عالم کے وقت تک مغلوں کے بائیس صوبوں کی حالت سے ہوتا ہے۔

کابل، قندھار اور پیشاور کے صوبے احمد شاہ ابدالی کے بیٹے کے اختیار میں تھے۔ ملتان، بھٹھ اور بھکّر کے تین صوبے سکھوں کے قبضے میں تھے۔ دکن کے چھ صوبے گجرات اور مالوہ مرہٹوں کے اقتدار میں ڈھاکہ اور عظیم آباد پر میر قاسم کے بعد انگریزوں کا اقتدار تھا اور اودھ کا صوبہ الہ آباد، سنبھل، مرادآباد اور اٹاوہ نواب آصف الدولہ کے قبضے میں تھے اور وہاں بھی انگریز اپنی طاقت بڑھا چکے تھے۔ اجمیر کا صوبہ راجاؤں کے پاس تھا۔ اکبرآباد کا صوبہ اور دہلی کے کچھ محلات پر نجف خاں قابض تھا دہلی کے صوبے کا بقیہ حصّہ شاہ عالم کے پاس تھا۔

میر تقی میر نے اپنے والد کی وفات کے بعد تلاشِ روزگار میں محمد شاہ کے زمانے دہلی گئے جہاں پر کبھی مصاحبت کبھی فوجی ملازمت اور کبھی امراء کے اصلاحِ کلام اور اتالیق کی طرح سے اپنا گزارہ کیا۔ پینتالس سال دہلی میں گزارے۔ شروع میں چچا نے خانِ دوراں سے ایک روپیہ روزینہ مقرر کروایا اور اکبرآباد لوٹ آئے۔ لیکن نادرشاہ کے حملے میں خانِ دوراں کی وفات کے بعد روزی کی تلاش میں پھر دہلی پہونچے۔ میر پر نادرشاہ کے حملے کا بہت اثر رہا۔ جو کہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم حادثہ تھا۔ کروڑوں روپئے، تختِ طاؤس، بیش قیمتی جواہرات وساز سامان اور سندھ ندی کے پاس کے علاقے اور افغانستان اس کے قبضے میں آ گئے۔ 1747 سے 1761 تک احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے مغلیہ سلطنت کو دوچار ہونا پڑا۔ اس کے علاوہ 1753 میں سورج مل جاٹ نے دہلی کو ویران کیا۔ اور رضابطہ خاں نے مرہٹوں کے ساتھ مل کر دہلی پر حملہ کیا اس طرح

عہد میرؔ میں جو دہلی مغلوں ں کے اقتدار میں بچی تھی وہ بھی بار بار شورشوں کا شکار بنی۔ میرؔ کے کلام پران المناک حوادث کا اثر خوب نمایاں ہوتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اب شہر کی گلیوں میں جو ہم ہوتے ہیں
منہ خونِ جگر سے دم بدم دھوتے ہیں

کس کا کیا ہے تازہ حوادث نے ایسا خوں
ہر صبح آفتاب پئے ہے لہو کا جام

صاف سارا شہر اس انبوہ خط میں لٹ گیا
کچھ نہیں رہتا ہے واہ جس راہ لشکر چلے

فتنے فساد اٹھیں گے گھر گھر میں خون ہوں گے
گر شہر میں خرا ماں وہ خانہ جنگ آیا

جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا
ہمارے وقت میں تو آفتِ زمانہ ہوا

خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

حال گلزار زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق
رنگ کچھ اور ہی ہو جاتے ہیں اک آن کے بیچ

یاں حادثے کی باؤ سے ہر اک شجر حجر
کیسا ہی پائیدار تھا آخر اکھڑ گیا

میر محمد شاہ کے وزیر قمر الدین کے بھانجے اور قریبی تعلقاتی رعایت خاں سے منسلک رہے۔ ان کے ساتھ احمد شاہ ابدالی کے خلاف جنگ کے لئے بھی گئے۔ جب محمد شاہ کے انتقال کے بعد صفدر جنگ کے ہاتھ میں اختیار آیا تو میرؔ کو رعایت خاں کی ملازمت چھوڑ کر نواب بہادر

جاوید کی پناہ میں جانا پڑا۔ جو اس دور کے نہایت پر اثر امیر تھے۔ پھر راجہ جگل کشور کی سفارش پر دیوانِ خالصہ راجہ ناگرمل تک رسائی ہوئی۔ ۱۷۵۰ء میں احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت اپنے متعلقین کے ساتھ شہر چھوڑ دیا۔ راجہ جگل کشور کی بیوی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان کو برسانہ تک لائیں وہاں سے کمبھیر تک گئے۔ وہاں صفدر جنگ کے خزانچی بہادر سنگھ نے انہیں پناہ دی پھر راجہ بشن سنگھ نے بھی ان کی مدد کی ۱۷۶۱ء میں پانی پت میں مرہٹوں کی شکست کے بعد میرؔ راجہ ناگرمل کے ساتھ دہلی آئے اور پھر راجہ ناگرمل کے ساتھ سورج مل جاٹ کے پاس اکبرآباد گئے لیکن پندرہ دنوں کے بعد پھر کمبھیر لوٹ آئے جہاں پر راجہ پرتھوی سنگھ نے پناہ دی۔ سورج مل کے قتل کے بعد وہ کاما چلے گئے۔ راجہ ناگرمل کے بیٹے رائے بہادر سنگھ سے ملاقت ہوئی اس نے میرؔ کی مدد کی لیکن زیادہ کرم فرمائی نہیں کر سکا پھر حسام الدولہ کے بھائی وجیہ الدین نے وظیفہ طئے کیا بعد میں نواب آصف الدولہ کے بلوانے پر لکھنو گئے اور وہاں وظیفہ طے ہوا آصف الدولہ کی وفات پر نواب سعادت علی خاں نے اسے جاری رکھا لیکن وظیفہ کی رقم وقت پر نہ ملنے کی وجہ سے میرؔ کو اکثر طرح طرح کی مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔

میرؔ کا تمام امرا سے تعلق رہا اور انہوں نے امرا کے حالات کا قریب سے جائزہ لیا تھا۔ ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ امرا سے وابستگی بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔

جتنے یاں ہیں امیر بے دستور　　پھر یہ حسنِ سلوک سب مشہور
پہنچنا ان تلک بہت ہے دور　　بات کرنے کا واں کسے مقدور
حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

۱۸ویں صدی کے نصف نظام تک منصب داری کی تمام کمزوریاں عیاں ہوگئی تھیں۔ خصوصاً جاگیروں کا مسئلہ سنگین ہو گیا تھا۔ منصب داروں کی تعداد کثیر ہو جانے سے ان کو تنخواہیں نہیں مل پا رہی تھیں۔ اس کا اثر فوج پر پڑ رہا تھا کیوں کہ ہر منصب دار سے سپاہی منسلک ہوتے تھے اور ان کو اپنی روزی کے لئے منصب داروں کے رحم و کرم پر منحصر رہنا پڑتا تھا۔ میرؔ نے

''درحالِ لشکر'' میں اپنے سیاسی افکار اور اس وقت کے حالات کی نشاندہی کی ہے۔

مشکل اپنی ہوئی جو بو دو باش　　آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش　　ہے لبِ ناں پہ سو جگہ پر خاش
نے دمِ آب ہے نہ چمچۂ آش
عمدے جو ہیں دنوں کو بھرتے ہیں　　سو بھی اسباب گروی دھرتے ہیں
ہیں سپاہی سو بھوکوں مرتے ہیں　　لوہو پی پی کے زیست کرتے ہیں
ایک تلوار بیچے ہے ایک ڈھال

تاریخی حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے بعد کے بادشاہوں کے وقت میں سپاہیوں کی حالت پر آشوب ہوتی جارہی تھی۔ محمد شاہ کے وقت میں سپاہیوں کو تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ احمد شاہ کے عہد میں پورے تین سالوں تک سپاہیوں کو تنخواہیں نہیں دی گئیں۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ میر تقی میرؔ نے شہر آشوب میں سپاہیوں کا حال زار نہ صرف رسمی اور خیالی طور پر پیش کیا انہوں نے ذکر میرؔ میں بھی لکھا ہے کہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی لڑائی کے بعد جو سردار زندہ بچے وہ فقیروں کی طرح ٹہل رہے تھے۔ ہزار ہا بھاگے ہوئے سپاہیوں کے اسلحے زمینداروں کے ہاتھ میں آ گئے۔ گاؤں کے لوگ انھیں بھنے ہوئے چنے ایک ایک مٹھی بانٹتے تھے۔ (نثار احمد فاروقی، میر کی آپ بیتی ص۔۱۳۵) اس تاریخی پس منظر میں میر کا سپاہیوں کے بارے میں بیان محض خیالی نہیں تھا۔

جس کسو کو خدا کرے گمراہ　　آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ　　جس کو دیکھو سو ہے بہ حال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکھٹے آہ
دیکھے میں نے مصاحبانِ شہ　　نکلے سب حقیقت وبے تہ
ٹھہری آخر کو ان سے کچھ مت کہہ　　رہ سکے ہے کسی طرح تو رہ
ورنہ لشکر سے جا خدا ہم راہ

میر تقی میرؔ اس وقت کے سرکاری دفاتر کی بدانتظامی حاکم اور اس کے عملے کی بدحالی سے خوب واقف تھے اس دور میں حکام میں عمل کی طاقت سلب ہو چکی تھی۔ عوام کے کاموں میں تغافل برتتے تھے اور جھوٹے وعدوں سے تسلّی دیتے تھے، میرؔ نے ایک مخمس میں فردِ دستخطی کا تذکرہ کیا ہے جس میں انہوں نے بلاس رائے سے ایک فرد دستخطی جاری کرنے کے لئے کہا تھا۔ وہ 'سنو یارو بلاس رائے کا حال' کہہ کر اپنی پوری دکھ بھری داستان کو شعری جامہ پہناتے ہیں ؎

اب ترقی ہوئی وکیل ہوا　　اک عمدہ کے گھر دخیل ہوا
فوج کے لوگوں کا کفیل ہوا　　مجھ سے اڑ کر عبث ذلیل ہوا
جہل پر اس کے ہے بہ صحبتِ دال

اس پہ تنخواہ جو کہ کر لاوے　　سو وہ اپنا کیا ہی بھر پاوے
پاشکستوں کو برسوں دوڑاوے　　ایسے سے ہاتھ خاک کیا آوے
جس سے دل ہوں تہِ غبار ملال

درِحال لشکر میں میرؔ اس طرح رقمطراز ہیں ؎

جس پہ ٹھہرے ہے آکے سرداری　　ان سے ہم کو تھی چشم دل داری
معرفت ان کے بعد صدخواری　　فرد دستخط ہوئی جواک باری
جیسے کھینچے لکیریں کوئی نقاش

اس لکھے کا نہیں ٹھکانا کچھ　　وہم میں بھی نہیں ہے پاتا کچھ
جس پہ دستخط نہ آنے جانا کچھ　　بن نہ آیا مجھے بہانا کچھ
غیر اُس کے کہ لے اُٹھوں بشاش

میرؔ کے عہد میں نوکری کے کم مواقع تھے اور رشوت کا بازار گرم تھا، یقیناً میرؔ کو بھی ان حالات سے دوچار ہونا پڑا ہوگا اُن کے دلی جذبات کا اظہار درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے ؎

در پہ عمدوں کے روز و شب شروشور　　صرف یک سرفریب ورشوت خور

بے لئے دیکھیں نہ کسو کی اور　　مردہ شو پردہ سب کفن کے چور

رحمت اللہ براوّلیں نباش

میرؔ نے اپنے تنخواہ کی فرد دستخطی کسی دوسرے شخص کو دی تھی لیکن وہ آج کل پر ٹالتا رہا اور میرؔ کا کام نہیں ہو پایا۔

دستخطی فرد کا سنا جب نام　　کہنے لاگا کہ اب قریب ہے شام

بیٹھنے کا ہوا ہے وقت تمام　　پھر کسی روز کیجئے گا کلام

اب تو میرے نہیں حواس بحال

تب سے اب تک وہ فرد لاتا ہوں　　گاہ بے گاہ ان کے جاتا ہوں

وقت پاتا ہوں تو جتاتا ہوں　　پر جواب ان سے صاف پاتا ہوں

اب کی باری کا ہے یہ قیل ومقال

میر تقی میرؔ کو بھی روزگار کی تلاش میں بھٹکنا پڑا اور تمام تکالیف برداشت کرنی پڑی۔ اسی لئے وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

جانا نہ تھا جہاں مجھے سو بار واں گیا　　ضعفِ قومی سے دست بدیدار واں گیا

محتاج ہو کے ناں کا طلب گار واں گیا　　چارہ نہ دیکھا مفطر وناچار واں گیا

اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

سیاسی زوال کے ساتھ معاشی نظام پر بھی انحطاط کی کیفیت طاری ہو جانے سے متوسط اور غریب طبقہ معاشی بدحالی کا شکار تھی۔ خصوصاً شعراء کسی امیر سے وابستہ ہوئے بغیر خوشحال زندگی نہیں بسر کر سکتے تھے اس لئے ہر شاعر کسی نہ کسی امیر یا رئیس سے وابستہ ہو جاتے تھے اور انعام اعزاز حاصل کرنے کے لئے اپنے سرپرستوں کی خوشنودی میں محو رہتے تھے۔ وہ معاصرین میں کسی کو اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ میر تقی میرؔ نے مثنوی 'اژدرنامہ' میں تمام شعراء کو بطور تمثیل تمام جانوروں اور کیڑوں مکوڑوں سے تشبیہ کی اور خود کو اژدر کہا۔ میرؔ نے جاگیردارنہ نظام میں پرورش

پائی تھی اس نچلے طبقے والے جن لوگوں نے شعروشاعری میں حصہ لیا میر ان کو بھی دیکھ کر تکلیف میں تھے۔ کیونکہ اسے وہ نجیبوں کی شان پر ستم سمجھتے تھے انہوں نے ایسے شعراء کی ہجو کی ؎

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا
شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا (مثنوی تنبیہہ الجہال)

الغرض یاروں نے قیدیں دیں اٹھا
جو کوئی آیا اسے دی پاس جا
ٹک نہ استعداد سے کی گفتگو
کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو

'مذمت آئینہ دار' میں کہتے ہیں ؎

موشگافوں کا نہیں ہے نام اب
مدعیٔ شعر ہیں حجام اب

اس کے علاوہ نئی نسل کی فکری اور جذباتی تربیت میر کے لئے تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ جب تلاشِ معاش میں میر کو دہلی سے لکھنؤ جانا پڑا تو اوراقِ مصور دہلی کے کوچوں کی یاد اور لکھنؤ کا بدلا ہوا ماحول بھی انہیں وقتاً فوقتاً اپنے اوپر ستم لگتا تھا۔ ان کا درد انگیز لہجہ قابلِ ذکر ہے۔

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں کہاں کہاں لکھنؤ کی خلقت
اے وائے کیا کیا خدایا تو نے

خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ میں ؎

''لکھنؤ میں انھیں جو قدریں ملی تھیں وہ سطحی تھیں یا معنوی لکھنؤ کی تہذیب خوبصورت بھی تھی اور پر رونق بھی لیکن اس میں نہ گرمی تھی نہ

گداز۔اس کا حسن نظر کو تو فریب دے سکتا تھا لیکن دل کو نہیں۔اس لئے وہ باوجود اہل لکھنؤ کی قدردانی کے دہلی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے رہے۔کیونکہ اجڑی ہوئی دلّی ان کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔'' (میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری ص۔۲۵۶)

رہی نہ گفتہ میرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

تری چال ٹیڑھی تیری بات روکھی تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

برسوں سے لکھنؤ میں اقامت ہے مجھ کو لیک
یاں کے چلن سے رکھتا ہوں عزمِ سفر ہنوز

خراب دلّی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

میر تقی میرؔ کی تمام زندگی اپنے ذاتی مصائب زمانے کی تلخیوں اور متعدد تکلیف دہ مواقع سے دوچار ہوئی تھی۔ان کی آپ بیتی اور کلام سے ان کی شخصیت کے تمام عناصر منظر عام آتے ہیں اس سلسلے میں 'درشہرؔ کا ماحسب حالِ خود' 'مثنوی نسنگ نامہ' 'درہجو خانۂ خود' 'درہجو خانۂ خود کہ بہ سبب شدّتِ باراں خراب شدہ بود' قابلِ غور ہیں۔لیکن اس سے بھی زیادہ اہم نکتہ یہ ہے کہ میرؔ ۱۸ویں صدی کے خلقتِ عام کے نمائندہ ہیں اور اس وقت کے دانشور طبقے کی صفِ اوّل پر ہیں۔ان کے افکار کے شعری اور نثری پیش کش اس وقت کے عوام الناس کی ذہنی کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔بدلتے ہوئے ملکی حالات جیسے بادشاہ امرا،سلطنت کا تنزّل اور اس کے ردّعمل یکے بعد دیگرے آشکار ہو جاتے ہیں۔جو کہ مورخین اور غیر ملکی سیاحوں کے بیانات میں اتنے گہرائی سے نہیں مل پاتے ہیں ۱۸ویں صدی کی سیاسی،سماجی اور اقتصادی تاریخ سازی کے لئے میرؔ کو حوالے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔

'اب تو بھی قلم رکھ دے اے میرؔ ستم دیدہ' یہ کہہ کر میرؔ نے قلم رکھ دی لیکن ان کا رقم کردہ محض قصّۂ پارینہ نہیں ہے بلکہ ایک مستند تاریخ ہے۔

ڈراما 'میر تقی میرؔ'

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

زندگی کی یہ فرد گزاشت ۱۸ ہویں صدی کے مایہ ناز شاعر میر تقی میرؔ کی ہے۔ جن کی شاعری اردو میں کیا دنیا کی دیگر زبانوں میں کمیاب ہی نہیں نایاب بھی نظر آتی ہے کیونکہ ان کی فکر و صلاحیت کے آگے آج تک کسی شاعر و ادیب کا چراغ نہ جل سکا جنھیں میرؔ سے مماثلت دی جا سکے۔ میرؔ کی شاعری ہی نہیں زندگی بھی ادبی و تاریخی اسرار و رموز میں ملبوس ہے۔ چونکہ انھوں نے جس دور میں زندگی بسر کی اس میں سیاسی انتشار اور معاشی بحران اس قدر حاوی تھا کہ بسر اوقات مشکل اور دقت طلب تھا۔ اس کے باوجود میرؔ نے کبھی کسی صاحبِ حیثیت کی جی حضوری کو نہیں تسلیم کیا۔ جس کو محمد حسن نے اپنے اڈراما ''میر تقی میرؔ'' میں بڑے فنکارانہ طریقہ سے تمثیلی بنایا ہے جس سے میرؔ کی زندگی کے رازہائے سربستہ پوری طرح سے کھل کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

ڈراما میر تقی میرؔ پہلی مرتبہ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۷ء انجمن ترقی پسند مصنفین، لکھنؤ کے زیرِ اہتمام اسٹیج ہوا۔ اور بعد کو یہ ڈراما ۱۹۶۶ء میں محمد حسن کے اسٹیج ڈراموں کے مجموعہ ''میرے اسٹیج

نورینہ پروین، ریسرچ اسکالر اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

ڈرامے'' میں شائع ہوا۔ ان ڈراموں کے لکھوانے کی بہت کچھ ذمہ داری پروفیسر احتشام حسین صاحب کی ہیں۔ [1]

میرے اسٹیج ڈرامے، ص۔۹

پروفیسر محمد حسن ترقی پسند تخلیق کار ہیں جن کے یہاں تاریخی حقائق کی روشنی میں سیاسی انتشار، بدلتی ہوئی تہذیبی قدریں، زوال پذیر معاشرہ، سماج میں عورتوں کی حیثیت اور سماج کے کھوکھلے پن کو نمایاں کرنے کی کوشش نظر آتی ہے۔ اس ڈرامے میں بیک وقت ڈرامائیت اور ادبیت دونوں کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جو قاری و ناظرین پر دیرپا تاثر قائم کرتے ہیں۔

یہ ڈراما پانچ مناظر پر مشتمل، ۱۱ویں اور ۱۲ویں صدی کو محیط کئے ہوئے ہیں۔ جس میں میرؔ کی زندگی کے مختلف مدارج، منفرد مقامات اور حالات کو دکھایا گیا ہے۔ لیکن ڈرامے کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈراما کلاسیکی طرز کا ہے اور ارسطو کے نظریہ کو فوقیت حاصل ہے۔ اس ڈرامے کے حوالے سے یہ بات ذہن نشیں رکھنا چاہئے کہ بہت سی ادبی روایتوں کے لئے آبِ حیات'، 'تذکرہ خوش معرکہ زیبا' اور ''مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' سے مدد لی گئی ہے۔ جس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈراما نگار نے ڈرامے میں ہونے والی گمراہیوں اور غلط بیانیوں سے خود کو بری الذمہ بتایا ہے۔

> اس ڈرامے کا آغاز میر تقی میرؔ کے آبائی وطن اکبر آباد (آگرہ) میں درویش احسان اللہ کے رہائش گاہ سے ہوتا ہے جہاں درویش امان اللہ میر تقی میرؔ کے ہمراہ ان سے ملاقات کو آتے ہیں جنھیں علی متقی برادر عزیز کیا کرتے تھے جس کی نسبت میر ان کی فرزندی میں رہتے۔ ان کے ساتھ درویشوں کی صحبت میں جایا کرتے اور ان سے کسب فیض حاصل کرتے۔ جس کا اندازہ میرؔ کی شاعری اور زندگی سے لگایا جا سکتا ہے۔ جب درویش احسان اللہ میرؔ

کے بارے میں امان اللہ سے پوچھتے ہیں تو امان اللہ علی متقی کے حوالے سے تعارف کراتے ہیں اور میر کے لئے دعائے خیر کی استدعا کرتے ہیں جس پر احسان اللہ میر کو جس نصیحت آمیز جملوں سے ہم آہنگ کراتے ہیں وہ درج ذیل ہیں

''احسان اللہ ۔۔۔۔۔۔۔۔عزیز من، درد بڑی دولت ہے اپنے کو کسی کے حوالے کردے سارا عالم آئینہ خانہ ہے کہ اس آئینہ میں اپنی صورت پہچان سکتا ہے کسی میں محو ہو جا کہ اپنے کل کا شیدائی بنے جس کے لئے کبھی خزاں نہیں ہے عشق بڑی رحمت ہے اس آگ سے جو دل منور نہیں وہاں اندھیرا ہے۔ عالم میں جو کچھ ہے عشق کی کرامت ہے آگ اس کا سوز ہے۔۔۔۔۔ پانی اس کی رفتار ہے خاک اس کا قرار ہے ہوا اس کا اضطراب ہے موت عشق کی مستی ہے حیات اس کی ہوشیاری ہے۔'' [1]

میرے اسٹیج ڈرامے، ص۔۹۰

ڈراما نگار نے احسان اللہ کی زبانی وحدۃ الوجود کے نظریے کو بڑے فلسفیانہ انداز سے پیش کیا ہے جس میں زندگی کی تلخ حقائق ابھر کر سامنے آتی ہے اور حیات انسانی کو چند لمحوں کی دنیا میں بیداری، دور اندیشی اور بخوشی زندگی گزارنے کی جانب مائل کرتے ہیں۔ یہی فلسفۂ زندگی درویشوں کا شیوہ اور اس المناک دور میں زندگی بسر کرنے والوں کے لئے بہترین عطیہ تھا۔ کیونکہ اس زمانے تک دہلی میں تباہی و بربادی کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ خود مغلیہ حکومت اور ان کے شہنشاہوں کے ساتھ وہ بدسلوکیاں کی گئیں جو تاریخ کے صفحات کو آج بھی لہو آلود کرتے ہیں۔ جس کی دہشت سے اس دور کے لوگ محفوظ نہیں تھے اور اپنی تسلی و تشفی کے لئے درویشوں کی تعلیم و تربیت کو اپنی زندگی کا آلہ تصور کرتے تھے ۔

میرؔ کے والد اعلیٰ پایہ کے درویش تھے جنھیں دنیا داری سے دلچسپی نہ تھی ان کی سماجی و معاشرتی زندگی بہت خوشگوار اور سکونت پذیر نہ تھی اس وجہ سے میرؔ کو بھی دقتوں اور پریشانیوں سے گزرنا پڑا۔ دوسری جانب بڑے بھائی محمد حسن (جو دوسری والدہ سے تھے) میں رقابت کا جذبہ اتنا شدید تھا جس نے میرؔ کو احساس محرومی کے ساتھ ہی احساس ظلم سے لبریز کر دیا۔ محمد حسن کی بدسلوکیوں کا علم امان اللہ کو بھی تھا جب امان اللہ میرؔ سے گفتگو کرتے ہوئے ان کی ہم صحبت ماہ طلعت سے متعلق گفت و شنید کرتے ہیں تو ان کے اندر کا جذبۂ عشق آنسو بنکر بہنے لگتا ہے۔ میرؔ کے شدید زخم کا مداوا امان اللہ کن الفاظ میں کرتے ہیں ملاحظہ ہو ''امان اللہ: زندگی میں ایسے ہی کسی جنون کی ضرورت ہوتی ہے لختِ جگر، ایسا ہی کوئی جنون جس پر آرام چین، سکون، نیند سب کچھ وار دیا جائے۔ عشق اصل حیات ہے اس کے بغیر زندگی ایسا فانوس ہے جس میں نور اور روشنی نہ ہو۔ عشق حاصل کرو مگر ہوس سے بچو، عشق کے سہارے خدا تک پہنچو، عشق ترک ذات کے بغیر اس محبوب تک رسائی نہیں۔ ہوس شادکامی کی غلامی ہے اور عشق ایثار و قربانی کا نام ہے۔''

میرے اسٹیج ڈرامے، ص۔۹۴

امان اللہ کی زبانی ادا کئے گئے اس مکالمہ میں عشق کا اتنا وسیع اور ہوا و ہوس سے عاری تصور پوشیدہ ہے جو ایثار و قربانی اور نفسانی آلودگیوں سے پاک و پاکیزہ ہے۔ یہاں ڈراما نگار نے زمان و مکان کے اعتبار سے عشق مجازی پر عشق حقیقی کو فوقیت دی ہے جس کے ذریعہ انسان کو مغفرت حاصل ہوتی ہے۔

جب درویش امان اللہ کی وفات ہو جاتی ہے میرؔ زندگی کی دشوار راہوں پر تنہا رہ جاتے ہیں۔ ڈرامے کے دوسرے منظر میں میرؔ دیوان خانہ میں تنہا شعر گنگناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اسی دوران ان کی ہم صحبت ماہ طلعت پھوپھا جان کی (میرؔ کے والد) خیریت پوچھنے آتی ہے جہاں اس کی ملاقات میرؔ سے ہوتی ہے جو گذشتہ رات ماہ طلعت کی حویلی کے سامنے پیڑ کے نیچے اپنے ہاتھ زخمی کر کے اس کا انتظار کرتے ہیں کہ ماہ طلعت انھیں بلانے آئے گی لیکن وہ نہیں آتی جس کا پُر درد شکوہ میر ماہ طلعت سے کرتے ہیں۔ جس پر ماہ طلعت یہ عذر پیش کرتی ہے۔

''ماہ طلعت: لیکن اب میں کیسے آسکتی تھی وہ لڑکپن کی باتیں
تھیں۔ اب میں بلانے آتی تو دنیا کیا کہتی۔''

یہاں محمد حسن نے ماہ طلعت کی زبان سے جاگیردارانہ عورتوں کی معاشرتی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں عورت مرد کے آزادانہ میل ملاپ کو کسی بڑے عیب اور گناہ سے کم نہ سمجھا جاتا تھا عورت گھر کی چہار دیواری کے باہر قدم نہ رکھ سکتی تھی بلکہ دوسروں کے معمول کے مطابق زندگی بسر کرنا اس کے لئے ضروری ہی نہیں فرض بھی تھا۔ اس طرح ڈرامے میں ماہ طلعت کے الفاظ اس دور کی سبھی عورتوں کی کشمکش بن کر سامنے آتے ہیں۔

یکسوئی میں میرؔ و ماہ طلعت کی گفتگو کے درمیان وہاں محمد حسن کی آمد ہوتی ہے میرؔ کو ماہ طلعت کے ساتھ دیکھ کر ناگواری کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ انھیں بھی ماہ طلعت سے دلی وابستگی ہے جس کے باعث ان کے اندر کا حیوان خونخوار شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پہلے محمد حسن میرؔ کو اپنی تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں پھر ماہ طلعت پر اپنے بڑپّن کا رعب دکھاتے ہیں تب ماہ طلعت وہاں سے چلی جاتی ہے اور محمد حسن میرؔ کو اپنی جذبۂ رقابت کا نشانہ بناتے ہوئے بڑے ہی ظالمانہ انداز میں کہتے ہیں۔

''محمد حسن: سمجھ جاؤ گے مگر سیدھی طرح نہیں سمجھو گے میں بھی انسان
ہوں میرے سینے میں بھی دل ہے، ماہ طلعت میرے دل کی ملکہ ہے۔
تمہاری نگاہ اس کی طرف اٹھیں تو میں آنکھیں نکال لوں گا۔ تمھیں

اکبرآباد چھوڑنا ہوگا۔ میرے راستے میں آؤ گے تو برباد ہو جاؤ گے۔''

ڈراما نگار نے محمد حسن کی زبان سے جس دھمکی بھرے الفاظ کو پیش کیا ہے وہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ جب انسان میں رقابت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو وہ سبھی حدود و قیود اور رشتوں کا لحاظ رکھے بغیر درندگی اختیار کر لیتا ہے۔ ویسے تو پورا ڈراما ہی کلاسیکی طرز کا ہے لیکن جہاں وہ محمد حسن کے جذبۂ رقابت کو عام کرتے ہیں وہاں ناظرین وقاری کو میرؔ سے جذباتی وابستگی کا احساس ہوتا ہے جو کلاسیکی ڈراموں کی خصوصیات کہی جاسکتی ہیں۔

میرؔ کے والد اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنی تین سو کتابوں کا اثاثہ تقسیم کرنے کی غرض سے دونوں بیٹوں کو بلاتے ہیں اور اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ بڑے بھائی محمد حسن اس فیصلہ سے راضی نہیں ہوتے اور ساری کتابوں کو میرؔ کے لئے بے معنی بتاتے ہوئے اپنی دسترس میں لینا چاہتے ہیں جس کو میرؔ بخوشی تسلیم کر لیتے ہیں۔ میرؔ میں صبر و تحمل اور قربانی کا یہ جذبہ دیکھ کر والد محترم انھیں تا زندگی فراغی و سپردگی سے بسر کرنے کی دعائیں دیتے ہیں ساتھ ہی اپنے تین سو روپئے قرض کو ادا کئے بغیر جنازہ نہ اٹھانے کی ہدایت کرتے ہیں۔ والد کی ہدایت پر میرؔ اپنی بے سروسامانی کا ذکر کرتے ہیں تب والد انھیں تائید غیبی سے آنے والی امداد کا مژدہ سنا کر داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ والد کے انتقال کے بعد میرؔ کو زندگی میں اور زیادہ خلاء محسوس ہونے لگتا ہے کیونکہ میرؔ کے دلعزیز چچا پہلے ہی انتقال کر چکے ہیں اور بڑے بھائی محمد حسن نے اکبرآباد چھوڑنے کی دھمکی دی ہے یہ کیفیت ان میں عجب بیزاری رونما کر دیتی ہے۔ میرؔ کی خود کلامی کا یہ مکالمہ پیش ہے۔

''میر صاحب: ماہِ طلعت کو چھوڑنا ہوگا؟ کیونکر چھوڑ سکوں گا؟ اکبرآباد چھوڑنا ہوگا؟ نہیں! مجھ سے یہ سب نہیں چھوٹ سکیں گے۔ میں اپنے دل کو پتھر کیسے کر لوں؟ میں بھی انسان ہوں میں بھی جینے کا حق رکھتا ہوں، خوش ہونے کا حق رکھتا ہوں۔ (پھر حسرت سے اسٹیج پر چاروں

طرف دیکھتے ہوئے) کیا ایثار کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنی ہوگی۔
خدایا! میں کس طرح اپنے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں، کس طرح
اسے دوسروں کے لئے قربان کردوں۔''

میرے اسٹیج ڈرامے، ص۔۱۰۲

میرؔ کی زبانی ہونے والی اس خودکلامی میں جذبات کا ایسا تصادم ہے جو میرؔ کی بے کیفی و مظلومی کے ساتھ اس پورے دور کی بے کیفی و مظلومی کو ظاہر کرتے ہیں چونکہ اس دور تک مغلیہ سلطنت کو دوسری طاقتوں نے اس قدر ہلا کر رکھ دیا تھا کہ اس کے اثرات سے قریب کی جگہوں کے لوگ بے حد متاثر تھے۔ ڈراما نگار نے میرؔ کی اس خودکلامی کو شعوری طور سے ڈرامے میں چسپاں کیا ہے جس سے ناظرین وقاری کا تزکیۂ نفس آسانی سے کیا جاسکے۔

دہلی میں جب میرؔ کے گزر اوقات مشکل سے مشکل ہو جاتے ہیں تو وہ دہلی کا رُخ کرتے ہیں اور خان آرزو کے دیوان خانہ میں بڑی سنجیدگی اور تحمل مزاجی سے شرکت کرتے ہیں۔ جس کا احساس وہاں موجود شرکاء کو نہیں ہوتا کیونکہ محفلِ شعر و سخن گرم ہے۔ درمیان میں ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوتی ہیں جس میں میرؔ کے سوز و گداز کا بھی تذکرہ ہوتا ہے اور یہاں موجود سبھی شعراء ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہاں موجود شعراء میں خان آرزو، احسن، شیخ صاحب، شاہ صاحب اور سوداؔ ہیں۔ پھر سودا سے تازہ کلام کی فرمائش کرتے ہیں۔ سودا ایک شعر سنا کر خواجہ صاحب کے یہاں مشاعرہ میں شرکت کی اجازت لیکر احسن اور شیخ صاحب کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں۔ ان سبھی کے رخصت ہوتے ہی خان آرزو اکبرآباد سے محمد حسن کا بھیجا ہوا خط تکیہ سے نکال کر پڑھنے لگتے ہیں جس میں میرؔ سے عداوت کی بنا پر ان کے کردار پہ حرف لگاتے ہوئے انھیں اپنے یہاں پناہ نہ دینے کی بھی درخواست کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کو مکمل خط سنانے کے بعد خان آرزو خط کو تکیے کے نیچے رکھنے کے لئے مڑتے ہیں تو ان کی نظر وہاں موجود میر تقی میرؔ پر پڑتی ہے۔ حال خیریت کے بعد ان کا تعارف شاہ صاحب سے کراتے ہیں اور سوداؔ کی فکرِ سخن میں شعر کی

فرمائش کرتے ہیں۔ میرؔ کا سودا کی زمین میں یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

خان آرزو اور شاہ صاحب اس شعر کی بھرپور تعریف کرتے ہیں۔ میرؔ اس شعر کو بار بار دہراتے ہیں چونکہ ان کے اندرون میں جو بے چینی و بے قراری ہے اسے کسی طرح تسلی نہیں حاصل ہوتی اور میرؔ پر جنون کی کیفیت لاحق ہو جاتی ہے تبھی اسٹیج سے روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ پس منظر سے میرؔ کی مثنوی کے اشعار غمگین موسیقی کے ساتھ ابھرنے لگتے ہیں جو میرؔ کو بدحواس و سرشار کر دیتے ہیں کہ ان کے خواب و خیال میں چھائی ملکہ (ماہ طلعت) اپنی حقیقی حرکتِ عمل میں نظر آنے لگتی ہے عالمِ خیال میں میرؔ کی ماہ طلعت سے ہونے والے شکوہ شکایت کا یہ منظر ملاحظہ ہو۔

''میرؔ:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ماہ طلعت ماہ طلعت!

ماہ طلعت:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اپنے سارے وعدے وعید بھلا دیے۔

اتنی جلدی فریاد کرنے لگے

میرؔ: ایسی زندگی کو کہاں سے جگر لاؤں۔

ماہ طلعت: تم نے وعدہ کیا تھا کہ سینے میں دل جل کر راکھ ہو جائے گا اور ہونٹوں سے آہ نہ نکلے گی۔ تم نے میرا پیار عمر بھر کا سکھ چین دیکر اپنایا تھا۔

میرؔ: مجھ سے تمہارے بغیر زندہ نہ رہا جائے گا۔

ماہ طلعت: (لوٹ آتی ہے اور گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے)

ماہ طلعت سے اس طرح خفا نہ ہو۔ میری زندگی تمہارے پیار کی روشنی سے ہمیشہ جگمگائے گی مگر اب میں کسی اور کی ہو چکی ہوں۔ مجھے گنہگار نہ کرو۔ اپنا یہ نور دنیا کو بخش دو تمہارے لئے اس دنیا کے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم تو اس کی مانگ میں افشاں چن دو۔ اس کے آنگن میں دئے

جلادو۔اس کی جھولی گیتوں اور پھولوں سے بھر دو۔''

میرے اسٹیج ڈرامے، ص۔۱۱۳۔۱۱۲

میرؔ کے عالمِ خیال میں ماہ طلعت سے ہونے والی اس رومانی گفتگو کو محمد حسن نے بڑے ہی ڈرامائی انداز سے پیش کیا ہے جس سے قاری و ناظرین کی دلچسپی برقرار رہے نہ کہ ڈرامے میں بوریت اور بوجھل پن محسوس ہونے لگے۔ ڈراما نگار نے اس رومانی مکالمے میں ایک بار پھر جاگیردارانہ سماج کی عورتوں کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں ان کی کوئی وقعت واہمیت نہ تھی۔عورتیں اپنے جذبات اور فیصلہ پر سماج ومعاشرت کے حکم کو فوقیت دیتی تھیں۔اس مکالمے میں محمد حسن کلاسیکی طرز سے ہٹ کر ایک نئے زاویہ کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

اس گفتگو کے بعد میرؔ پہ دورے پڑنے لگتے ہیں۔خان آرزو چند لوگوں کے ساتھ مل کر انھیں گھر کو لے جاتے ہیں اسی کے ساتھ ہی اسٹیج کی تاریکی روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے جو دہلی کے برعکس لکھنؤ کی خوشگوار فضا کی علامت ہے۔چونکہ اس دور کی دہلی ابتری کی اس منزل سے گزر رہی تھی جس میں میرؔ جیسے صاحب احترام کو ذلیل وخوار اور تنگ دستی سے گزرنا پڑ رہا تھا جسے اس ناخوشگوار حالات میں رفع کرنے کا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔لیکن اس باہمی کشمکش کے دور میں شعر وادب کے لئے راہیں ضرور ہموار ہوئیں۔۔چونکہ ہمارے شاعر جن حالات ومسائل سے دوچار ہوتے ہیں اور جن کیفیات کو محسوس کرتے ہیں انھیں اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کے روبرو پیش کرتے ہیں اس زمانے تک لکھنؤ میں مرزا رفیع سوداؔ انتقال کر چکے،نواب آصف الدولہ شعر و شاعری کے دلدادہ تھے اور میرؔ سوز کو استاد تسلیم کرنے کے باوجود بھی میرؔ کی عظمت وبڑائی کے معتقد تھے اور اپنے ماموں سالار جنگ سے میرؔ کو لکھنؤ مدعو کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

میرؔ لکھنؤ میں ایک دیوان خانہ میں بڑی خاموشی اور شائستگی سے پہنچتے ہیں جہاں کچھ بے فکرے اور بانکپن قسم کے لوگ بغل میں مرغ دبائے نواب آصف الدولہ کی آمد کے منتظر ہیں ان کی آپسی گفتگو ایک دوسرے کے مرغ سے بہتر ثابت کرنے کی ہے اس کے شعر وشاعری کا چرچا

شروع ہوتا ہے۔ جس میں سبھی اپنے کو اردو کے ہم پلّہ اور ہم فہم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کچھ دوسرے قسم کی بحثیں بھی ہوتی ہے۔ اس درمیان اور میرؔ کے حالات اور دہلی کے مسائل پر جو قیاس آرائی کی جاتی ہے اس صورتِ حال کا منظر ملاحظہ ہو ۔

''مرزا: ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دلّی میں سخت پریشان ہیں صفدر نواب بتاتے تھے کہ درّانی نے دلّی کو تاراج کیا پھر دکنیوں نے وہ لوٹ مچائی کہ اہلِ سیری دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ میرؔ صاحب راجہ ناگرمل کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے اور ہر چند راجہ نے مشاہدہ معقول مقرر کیا تھا مگر سراسیمہ اور پریشان حال رہے۔ صفدر نواب بیان کرتے تھے کہ میرؔ صاحب لشکر شاہی کے ایک ایک سرکردے کے پاس گئے چونکہ شہرت کمال تھی لہٰذا چند لوگوں نے توجہ کی کہ اس طرح کا باکمال اور یوں کندہ بلیوں کی سی زندگی بسر کرے۔''

میرے اسٹیج ڈرامے، ص۔۱۱۱

مرزا کے ذریعہ ادا کئے گئے اس مکالمہ میں دہلی کی خونریز تباہی و بربادی اور تاراجی کو پیش کیا گیا ہے جس سے میرؔ قیامِ دہلی میں نبرد آزما ہوئے۔ حالانکہ یہاں ڈراما نگار نے رزمیہ کو اشارتاً ہی بیان کیا ہے لیکن میرؔ کی زندگی کو تمثیلی انداز میں احاطہ کرلیا ہے جس کے باعث ڈرامے میں شروع سے آخر تک المیاتی تصور برقرار رہتا ہے۔ جس کو ارسطو نے ڈرامے کی کامیابی کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔

لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ نے شعر و شاعری کی سرپرستی کی اور میرؔ کو تعظیماً اپنے دربار میں جگہ دی لیکن میرؔ کی خودداری اور انانیت نے وہاں بھی انھیں پُرسکون زندگی نہ بسر کرنے دی اور ایک روز جب نواب آصف الدولہ حوض کی مچھلیوں سے کھیل رہے تھے میرؔ سے شعر کی فرمائش کرتے ہیں اور جب میرؔ شعر پیش کرتے ہیں تو کوئی خاص توجہ نہیں دیتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ

شعر انھیں خود متوجہ کرے گا۔ اسی وقت وہاں میر سوز پہنچتے ہیں جن سے آصف الدولہ غزل پیش کرنے کو کہتے ہیں اور ان کے ہر شعر پر بلا مبالغہ تعریف کرتے ہیں اور میر سوز کے متعلق نظریات میرؔ سے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میرؔ جو کہ سوز کو شاعر ہی تسلیم نہیں کرتے لیکن نواب کے استاد ہونے کی وجہ سے ایک چوتھائی شاعر ماننے کو راضی ہو جاتے ہیں۔ نواب آصف الدولہ کا خیال رکھے بغیر بڑی بے باکی اور حیرت مندی سے انھیں اپنے سامنے شعر پیش کرنے کے لائق نہیں تسلیم کرتے جس پر نواب آصف الدولہ برہم ہوتے ہیں حالانکہ میر سوزؔ گفتگو کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرؔ کو نواب آصف الدولہ کی یہ تجویز قطعی پسند نہیں آئی اور وہ فقر و فاقہ کو نواب کی سرپرستی پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب نواب آصف الدولہ کے پاس اپنا استعفیٰ لیکر پہنچتے ہیں تو نواب اس کی بابت پوچھتے ہیں تب میرؔ یوں وضاحت کرتے ہیں۔

''میرؔ: قصور میرا ہی تھا جہاں پناہ! سخن کی آبیاری خونِ جگر سے ہوتی ہے رنج و محبّت اس کی خوراک ہیں۔ شعر کے لئے خودداری اور آزادی درکار ہے مسرت نہیں۔ میں دربار میں خودداری، آزادی اور مسرت ڈھونڈنے آیا تھا یہ فریب تھا۔ مجھے زندگی بھر رونا ہے خونِ جگر نذر کرنا ہے پھر میں مسرت کے نام یہ سونے کی زنجیریں کیوں پہنوں۔ یہ سلطنت زماں و مکاں کے ایک سرے سے دوسرے تک پھیلی ہوئی ہے۔ سوز و ساز کی تعلیم میری ہے، درد و داغ کی سلطنت میری ہے مجھے تو لہو کے چراغوں سے ان اندھیروں میں چراغاں کرنا ہے اس شمع کو کوئی فانوس نہیں پہنا سکتا اس روشنی کو کوئی زنجیر نہیں پہنا سکتا۔''

میرے اسٹیج ڈرامے، ص۔ ۱۲۴

یہاں ڈرامہ نگار نے میرؔ کے آصف الدولہ کو دیے گئے استعفیٰ میں ان کی شاعری کے آفاقی تصور کو پیش کیا ہے جو دربار کے محدود دائرے میں ممکن نہ تھا۔ میرؔ کا یہ استعفیٰ ماضی کی

تاریکیوں کو چیرتے ہوئے حال سے ہم آہنگ کراتے ہیں اور حال کو مستقبل سے روشناس کراتے ہیں۔ محمد حسن نے ڈراما 'میر تقی میر' میں میر کی زندگی کا احاطہ کرتے ہوئے تاریخی حقائق سے استفادہ کیا ہے۔ جس میں ۱۸ ہویں صدی کی لٹتی ہوئے جنت، الٹتی ہوئی بساط اور جاتے ہوئے کارواں کی روداد شامل ہے۔ ان سبھی خوبیوں کو پیش کرتے ہوئے ڈرامے کی فنی صلاحیتوں کو برقرار رکھا ہے جو محمد حسن کے اسٹیج ڈراموں میں منفرد حیثیت اور طریقہ کار کا حاصل ہے۔

اتر پردیش اردو اکادمی کی تازہ ترین مطبوعات

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف کا نام	قیمت
1	اردو مثنوی کا ارتقاء	عقیل رضوی	Rs. 75/=
2	انقلاب ۱۸۵۷ء	شیخ حسام الدین	Rs.80/=
3	یادگار غالب	الطاف حسین حالی	Rs.38/=
4	دلی کا دبستان شاعری	نور الحسن ہاشمی	Rs.101/=
5	کلیات ولی	نور الحسن ہاشمی	Rs.148/=
6	مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن	ملک زادہ منظور احمد	Rs.88/=
7	اردو ادب کی ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	ڈاکٹر منظر اعظمی	Rs.177/=
8	جوش ملیح آبادی (انسان و شاعر)	سید احتشام حسین	Rs.32/=
9	زندگی اے زندگی	خلیل الرحمان اعظمی	Rs26/=
10	اردو مرثیہ کا ارتقاء	مسیح الزماں	Rs.136/=
11	اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر	سید مجاور حسین	Rs.59/=
12	سلاطین دہلی کے عہد میں	صباح الدین عبدالرحمان	Rs.32/=
13	ابن الوقت	ڈپٹی نذیر احمد	Rs.91/=
14	تحقیق کا فن	گیان چند جین	Rs.170/=
15	مطالعہ اقبال	اقبال سیمنار کے مقالات	Rs.24/=
16	شعرائے اردو کے تذکرے	حنیف نقوی	Rs.165/=
17	ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ	رشید حسن خاں	Rs.64/=
18	آب حیات	محمد حسین آزاد	Rs.51/=
19	اردو غزل میں علامت نگاری	انیس اشفاق	Rs.75/=
20	انیس شخصیت و فن	فضل امام	Rs.77/=
21	ہندوستانی تہذیب	اقبال حسین	Rs.30/=
22	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	سید احتشام حسین	Rs.36/=
23	مقالات صدیقی	مسلم صدیقی	Rs.66/=
24	الہلال (تین حصوں میں مکمل سیٹ)	مولانا ابوالکلام آزاد	Rs.4200/=

اکادمی کی مطبوعات کے آرڈر کے لئے رابطہ کریں۔

سید محمد حسین سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر لکھنؤ۔ فون نمبر 0522-2720683